# انا البحر

## عبدالسلام اظہر

ترتیب و تہذیب

اسمٰعیل وفا

کتاب کا نام: انا البحر

شاعر: عبدالسلام اظہرؔ

اشاعت اوّل: 1991ء

اشاعتِ دوّم: 2019ء

مرتّب: اسمٰعیل وفاؔ

کمپیوٹر کمپوزنگ: **ایم۔اے** کمپیوٹرس 9823185197

مطبع: منشی پریس، مالیگاؤں

تعداد: 500

قیمت: 199/-

ناشر: عبدالرحمٰن چھیدی

کتاب ملنے کا پتہ: سٹی بک ڈپو، محمد علی روڈ، قصاب باڑہ مسجد، مالیگاؤں

فون نمبر: 09226728995

08087140473



## انتساب

◉ اُن شفیق ہاتھوں کے نام.......................................

جو خون تھوکتے اظہرؔ کو تھپکیاں دیتے تھے!

◉ اُن آنکھوں کے نام.......................................

جن میں اظہرؔ کے لئے

دعاؤں کے پھول کھلتے تھے!

◉ اُن دلوں کے نام...................جن میں اظہرؔ کے لئے

رحم کا دریا موجزن رہا!

◉ اُس ہستی کے نام...................جو اظہرؔ کی ماں ہے۔

جس کا آنچل

زندگی کی کڑی دھوپ میں

اس کے لئے سایۂ ابر بنا رہا!!

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ ''انا البحر''
ہم اس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا
غالبؔ

# اظہارِ تشکر

## عبدالرحمٰن چھیدی

میرے بھائی عبدالسلام اظہر کا مجموعۂ کلام 'انا البحر' ۱۹۹۱ء میں بزمِ اربابِ ذوق کے صدر و اراکین کی خصوصی دلچسپی و معاونت سے منظرِ عام پر آیا تھا اور جلد ہی فروخت ہو گیا۔ اس کے بعد مجھ سے بہت سارے افراد نے رابطہ کیا اور اس کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کی بات کی لیکن مَیں ذاتی مصروفیات کے سبب راضی نہ ہوا۔

دوسرا ایڈیشن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ میں اللہ رب العزت کا شکر گذار ہوں کہ یہ کام بحسن وخوبی مکمل ہوا۔ اس ایڈیشن کے لئے محترم سلیم شہزاد صاحب نے مضمون لکھا۔ مَیں ان کا بیحد مشکور ہوں کہ ان کے مضمون کی بدولت اظہر کے کلام کے پردے اٹھے۔ جناب سلطان سبحانی نے پہلے ایڈیشن کا سرورق بنایا تھا اور ایک مضمون لکھا جو ان کی کتاب سکۂ خاک میں شامل ہے۔ ان کے شکریے کے ساتھ یہ مضمون اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کے سلسلے میں مَیں آگے پیچھے ہو رہا تھا۔ عزیزی یٰسین دانش نے ملاقات کی اور ایسے پُرعزم انداز میں گفتگو کی کہ میں متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ دانش نے ہی اسمٰعیل وفا سر کو دوسرے ایڈیشن کی تیاری کے لئے آمادہ کیا، نتیجہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ میں یٰسین دانش صاحب کا بہت زیادہ شکر گذار ہوں کہ ان کی انتھک محنت کی بدولت یہ ایڈیشن منظرِ عام پر آیا۔





اسمٰعیل وفا سر نے پہلے ایڈیشن کی بہ نسبت دوسرے ایڈیشن کو نئے انداز میں پیش کیا۔ مضامین اکٹھا کئے، اظہر کی دستخط اور شعراان کی تحریر میں جمع کیا اور ساتھ ہی اظہر کی بکھری ہوئی تحریروں کو جمع کر کے ایک نیا مضمون تیار کیا جس میں اظہر کے ہی الفاظ میں اس کی آپ بیتی ہے۔ یقیناً ان بکھری تحریروں کو سمیٹنا بہت مشکل کام تھا جس کے لئے مَیں اسمٰعیل وفا سر کا بہت زیادہ شکر گذار ہوں۔

اظہر کی ذاتی زندگی سے متعلق معلومات کیلئے حیدری محمد طٰہٰ نے کافی جدوجہد کی میں ان کا بھی تہہِ دل سے مشکور ہوں۔

عبدالرحمٰن چھیدی
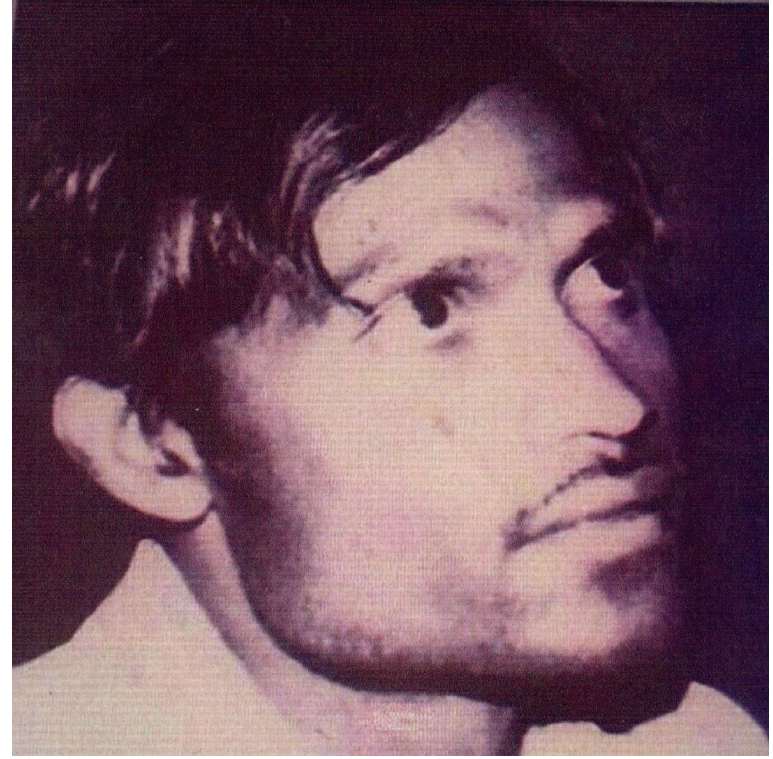
# الاؤ کا سفر

عبدالسلام اظہر

میں خواب دیکھتا ہوں۔تتلی کے پروں جیسے رنگوں سے سجے ہوئے ،دھنک کی طرح خوبصورت خواب اور ہر خواب ٹوٹ جاتا ہے ریت کے گھروندوں کی طرح۔مگر جینے کے لئے ایک سہارا بہت ضروری ہے کچھ دن ٹوٹے خوابوں کا دکھ جھیل کر پھر کوئی خواب دیکھ کر اپنے آپ کو فریب دے کر مصروف رکھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ سب سراب ہے مگر پھر بھی سراب کے تعاقب میں سرگرداں رہتا ہوں۔

برسوں سے رت جگوں کی خراشیں ہیں آنکھ میں
اکثر میں سوچتا ہوں مری نیند کیا ہوئی

میں نے اسکول کی تعلیم نہیں حاصل کی ہے ۔ایک مکتب میں تعلیم حاصل کی ہے اور صرف ڈھائی برس۔اس مکتب میں قرآن پاک اور اردو زبان کے علاوہ فارسی کی تعلیم دی گئی۔ میں عربی زبان پر عبور حاصل کرنا چاہتا تھا مگر والد کی خود غرضی اور زر پرستی آڑے آ گئی اور میں کمسنی میں ہی درس گاہ سے نکل کر اس قتل گاہ

میں پہنچا دیا گیا جسے کارخانہ کہا جاتا ہے۔سورج کی پہلی کرن نمودار ہونے سے قبل سے کائنات پر تاریکی کی گرفت مضبوط ہونے تک مشینوں کے پُرشور، دہکتے ہوئے برزخ میں لوہے پر لہُو ٹپکانے کے بعد جو وقت بچتا وہ صرفِ مطالعہ ہو جاتا تھا۔ تاریخ اور ادب پسندیدہ موضوعات تھے۔

ایک زمانہ مطالعہ کرنے کے بعد میں نے سوچا کہ مجھے بھی شاعری کرنی چاہیئے اور یہ پہلا لمحہ تھا جب میرے اندر وہ ظالم شخص اظہر بیدار ہو گیا جو مفاد کی بجائے زیاں پسند کرتا ہے۔اب وہ شہر میں جمعہ جمعہ آٹھ دن سے عبدالسلام اظہر کے نام سے جانا جاتا ہے۔

میری والدہ سیدھی سادی خاتون ہیں۔انہوں نے ہمیشہ میرے والد کے ہاتھوں طرح طرح کی تکلیف اٹھائی ہے۔بھوک، غریبی، بیماری، گالی اور مار پیٹ کے علاوہ انہیں میرے والد نے کچھ نہیں دیا اور میں آج جو کچھ ہوں اپنی والدہ کی تربیت اور کاوش کا نمونہ ہوں۔

شام ڈھلتے ہی میرے وجود میں اظہر بیدار ہو جاتا ہے۔مَیں کسی سے ہارتا نہیں مگر اس شخص سے ہار جاتا ہوں۔ میں اس کی ناز برداری کیلئے راتوں کو سڑکوں پر آوارہ بنا پھرتا ہوں۔آسودگی اور آرام چھوڑ کر مصائب قبول کر لیتا ہوں۔ نہ جانے کتنے لمحے مَیں نے اپنی آوارگی کی نذر کر دیئے۔نہ جانے کتنی راتوں کا لہو پلایا ہے۔جب چاند جوان ہوتا ہے تو جیسے کوئی میرے اندر سے اکساتا ہے سڑکیں ناپنے کے لئے۔

مَیں ٹی۔بی کا مریض ہوں اور میرا مرض اس منزل میں ہے جہاں ہَوا کے جھونکے بھی ملک الموت ثابت ہوتے ہیں۔مَیں سویٹر اور مفلر استعمال نہیں کرتا میں بچپن ہی سے ان لوازمات سے محروم رہا اب ضد سی ہوگئی ہے۔ ضِد





موسموں کی سرد و گرم سے ہے اور اس لئے کہ مَیں اس ماحول میں ہوں جہاں نئے سویٹر خواب ہوتے ہیں اس طبقے میں ہوں جس کا کوئی فرد اگر نیا سویٹر لے کر یہ کہے کہ یہ New ہے تو اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ جب مَیں سردی کا احساس کر کے سویٹر پہننے کی بابت غور کرتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ یہ میری شکست ہوگی میری ہار ہوگی۔ کیوں کہ میں اس طبقے میں ہوں جس میں خود کو اجنبی محسوس کرتا ہوں۔ مَیں اس ماحول میں جس میں میرا مزاج ہم آہنگ نہیں ہے۔وہ طبقہ، وہ ماحول سردیوں کی پہلی لہر کے ساتھ پرانے سویٹروں پر ٹوٹ پڑتا ہے اور مَیں اس ماحول اور طبقے میں نئے سویٹر پہن کر بھی یہ جملہ برداشت کرنا نہیں چاہتا کہ کتنے میں ہاتھ لگا؟ میری طبیعت، میرا مزاج ہی اسی قسم کا ہے حالانکہ سردی میرے حق میں زہرِ قاتل ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ میں نے جس روز سویٹر پہن لیا اس روز اس بات کو تسلیم کرنے کے مترادف ہوگا کہ میں اس ماحول اور اس طبقے میں اپنی شمولیت پر مطمئن ہوں جو کہ میرے اوپر بار ہے۔

میں اتنی کم عمری ہی میں ایسے ایسے حالات سے گذرا ہوں کہ بعض اوقات مجھے خود بھی حیرت ہوتی ہے۔ میں وقت کی اتنی کروٹیں اور لوگوں کے بدلتے رویئے دیکھے ہیں کہ اب بڑی سے بڑی مسرّت بھی مجھے ایک سانحہ لگتی ہے۔میں ان بدنصیبوں کا عروج ہوں جو زخم زخم تلووٴں کے ساتھ سلگتے دشت کی دوپہر کے سفر کا عذاب جھیل رہے ہیں۔میں منجمد شبِ سیاہ کا وہ چراغ ہوں جس کی لویں لمحہ بہ لمحہ کمزور ہو رہی ہیں اور کمزور چراغ رات کا مقابلہ نہیں کرتے بلکہ سپَر ڈال دیتے ہیں تاریکیوں کے قدموں میں۔اور کچھ چراغ انا کے زعم میں کوشش کرتے ہیں لیکن ان کا انجام تاریکیوں کے خنجر سے قتل ہونا ہوتا ہے۔

خواب بہت خوبصورت ہوتے ہیں اور حقیقت کا لبادہ پہن کر اپنی خوبصورتی کھودیتے ہیں۔ زندگی میں کچھ خواب ایسے بھی ہونے چاہئیں جو خواب رہیں۔۔۔۔!

ترتیب : اسمٰعیل وفاؔ

پلاٹ نمبر 91، سروے نمبر 114/1، نزد پوارواڑی پولس اسٹیشن،
مالیگاؤں۔ #8857959406





# لہو کے (شعری) تقاضے

سلیم شہزاد

عبدالسلام اظہؔر کی غزلوں کے مجموعے کا نام ''انا البحر'' دیکھ کر غالب کے مقامی شارحین پکار اٹھے کہ غالبؔ کے شعر کی اس ترکیب کے حوالے سے اظہر اپنی انانیت اور خود پسندی کا اظہار کر رہا ہے۔ اگرچہ یہ شارحین بے چارے شعر کے کلیدی لفظ 'ساز' سے صرف نظر فرما رہے ہیں۔ وہ ''دلِ ہر قطرہ'' کے مفہوم سے واقفیت نہیں رکھتے، ''قطرہ / بحر'' کے معنوی نقص کی انہیں خبر نہیں اور شعر کے دوسرے مصرع کے تفہیمی امتناع کے متعلق تو ان میں سوچنے کی بھی صلاحیت نہیں پائی جاتی۔ غالبؔ کے شعر

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا

کی یہ چاروں معنوی وحدتیں یعنی ۱) دل ہر قطرہ، ۲) ساز ۳) انا البحر اور ۴) دوسرا مصرع، شعر کے ساخیتے میں اپنے لفظی انسلاک سے جو معنوی کلپت ترسیل کر رہی ہیں اس میں انانیت اور خود پسندی جیسے معمولی تصورات کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ اضافی ترکیب ''سازِ انا البحر'' کو توڑ کر اظہر نے مضاف الیہ ''انا البحر'' کا جملہ تو اخذ کر لیا لیکن شعر سے باہر آ کر اس کے معنی شعری ترکیب کے معنی سے بے ربط ہو گئے۔ اس جملے میں تعلّی اور تکبّر کے معنی ضرور پائے جاتے ہیں اور ممکن ہے کہ ہمارا شاعر اپنے طبعی آزار کے ساتھ ان عارضوں میں بھی مبتلا ہو لیکن اظہر کے کلامیے یعنی شعری مخاطبے کا معنوی ربط ''انا البحر'' سے زیادہ ''دلِ ہر قطرہ''

کی ترکیب سے میل کھاتا نظر آتا ہے۔

دل ہر قطرہ    یعنی    ہر قطرے کا دل

دل    یعنی    خون کا منبع

(دل اور قطرے کی شباہت بھی یہاں متوجہ کن ہے۔)

اس بحث کو اظہر کے شعری مخاطبے کے تناظر میں لے جائیں تو اس کا شعری اظہار ''دل اور خون'' کے تلازمات سے رنگین نظر آتا ہے۔لفظوں کے ساتھ رنگوں کی کثیر معنویت سے انکار ممکن نہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ''انا البحر'' اظہر کے شعری حوالوں سے ''انا البحر الدم'' ہے اس بات کو غالب کے حوالے سے کہیں تو اظہر کے یہاں دل تا جگر ساحل دریائے خون پھیلا ہوا ہے۔

یہ بھی ایک علمی مفروضہ ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر فرد کا اظہار اس کے اندرون کی ترغیب کا نتیجہ ہوتا ہے۔فرد کے طبعی، روحانی، نفسی اور ماحولی عوامل اس کی شخصیت کی تعمیر کے عوامل ہوتے ہیں۔ جو اسے اپنی ''واقعی ذات'' کے اظہار پر اُکساتے رہتے ہیں۔ یہ فرد اگر فنکار بھی ہے تو اس کا فنی اظہار یقیناً اس کے جذبات، احساسات کے واقعی رنگوں کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر ظہور پذیر ہوتا ہے۔عبدالسلام اظہر کے فنی اظہار کا رنگ سرخ ہے۔اس کے شعروں میں بکھرتے گلاب، شعلے، شفق، گل تر، گلاب چہرہ، لعل و گہر، شعلہ بار، گلرنگ منظر، برگِ گل، گلگشت، رنگِ حنا، موجۂ آتش، شعلہ رو، وغیرہ شعری لسانی تعملات بکثرت نظر آتے ہیں۔گلاب، شعلہ، شفق، حنا، چہر، لعل، سب سرخ رنگ کے حامل ہیں۔مگر ان کی معنویت ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہے۔گلاب کو اظہر نے مجرد لفظ کے طور پر نظم کیا ہے۔جس کے معنی بکھرتا گلاب، گلاب چہرہ، تازہ گلاب جیسی





ترکیبوں کے ''گلاب'' سے مماثلت نہیں رکھتے۔اسی طرح شعلہ، شفق، حنا، چہرہ، لعل کی سرخی، معنویت میں گلاب کی سرخی سے میل نہیں کھاتی۔اور سرخ رنگ سے اظہر کی یہ نفسی طبعی ہم آہنگی اس کی فطرت/عادت کا خلاصہ ہے۔محض تخیل کی اپج نہیں۔

طب یونانی کی ایک اصطلاح ہے: ''اخلاط اربعہ'' یعنی جسم کے اندرونی عضوی نظام سے خارج ہونے والی چار مخصوص رطوبتیں جن کے امتزاج سے طبیبوں کا خیال ہے کہ فرد کی مختلف طبعی نفسی کیفیات، اس کا امتزاج اور اس کی شخصیت کے عوامل نمو پاتے ہیں۔ یہ رطوبتیں خون، بلغم، صفرا اور سودا کہلاتی ہیں جن کی ترکیبی کمی بیشی فرد کی طبعی نفسی کیفیات پر اثر انداز ہوکر اسے ایک خاص مزاج اور طبیعت کا حامل بنا دیتی ہیں۔شاعر کہتا ہے ؎

اظہر لہو اگلنا ہی تقدیر بن گیا

نشاط شاہدوی کی طرح اور اسی عمر میں ''انا البحر'' کا خالق عبدالسلام اظہر دِق کے مرض میں مبتلا ہوا اور صحیح اور مکمل علاج نہ ہونے کی وجہ سے خون تھوکنے کی اس پر نوبت آپہنچی۔ بدن میں خونی رطوبت کے بڑھ جانے سے بدن کا مالک چڑ چڑا اور غصہ ور ہوجاتا ہے۔ انگریزی کے متعدد ڈراموں میں ایسے کردار پیش کئے گئے ملتے ہیں جن کی کردار سازی اخلاطِ اربعہ کے اسی طبی نکتے کے پیشِ نظر کی گئی ہے۔سنسکرت شعریات کے مطابق ڈرامے کے وہ کردار جو اوروں سے نفرت کرنے والے، غصہ ور اور ظالم ہوتے ہیں ان کی شخصیت خون پسند ہوتی ہے۔ایسے کردار کے اظہار کے ''رس'' کو رَودر رس کہتے ہیں (قابلِ غور ہے کہ جسمانی رطوبتوں کے اخلاط وامتزاج کا تصور سنسکرت شعریات میں 'رس'۔۔۔یعنی وہی رطوبت کا تصور کہلاتا ہے)۔ بدنی رطوبتوں/رسوں کے اخلاط کے نتائج افراد

میں ان کی طبعی، نفسی تبدیلیوں یا مختلف بیماریوں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

سارے بدن پہ سرد خموشی کا پیرہن
آنکھوں میں چیختی سی جلن، رات اور میں

جب کائنات سوتی ہے اظہر سکون سے
ہم دل جلوں کو ایسے میں بیدار دیکھنا

پہلے ہی سے ہے زندگی جیسے کوئی سزا
اب سانس لینا اور بھی دشوار مت کرو

جیسے شعروں سے اظہر اپنی جان لیوا بیماری کے مرقعے تخلیق کرتا ہے۔
لیکن ان سے بڑھ کر شاعر کا جسمانی درد اور روحانی کرب اس کے ان شعروں کے فنی پیکروں میں دکھائی دیتا ہے جب میں وہ خون اور لہو کے انسلاک سے بننے والی مختلف النوع شعری لفظیات کو پیش کرتا ہے۔ مثلاً

خون سے وضو کرنا    تلوے لہو لہو کرنا
خون تک نچوڑ دیا    سارے مناظر لہو ہوئے
خاک اور خون میں ڈوبی زمیں    اپنا لہو اچھالیے
دیدۂ خونبار    لہو میں ڈوبا علم
شہر خوں فشاں    فن اور لہو کے رشتے
خون میں آتشکدہ    اپنے لہو سے مات





سرکش خون    لہو کا رچاؤ
خون کہاں تک پانی کرتے
مرے لہو سے تو شمشیریں کند ہوتی ہیں
خون کا قطرۂ آخر    عذاب لہو میں جلنے کا
خون سے لکھنا پڑا    لہو سے گلکاری
خون کی سرگوشیاں    لہو کا نیا لباس
خون کا دریا    لہو کی شہادتیں

وغیرہ یہ لفظیات کہیں کہیں دہرائی بھی گئی ہیں۔ ان کا لسانی تجزیہ معانی کی متعدد سطحوں سے ہمیں آشنا کراتا ہے جیسے

رکھ کے ٹھنڈے خون میں آتشکدہ یہ چاندنی
قطرہ قطرہ نیند آنکھوں سے اٹھا لے جائے گی

ٹھنڈے خون میں آتشکدہ رکھنے سے شاعر کی مراد اپنی بیماری کے سخت تیز بخار سے ہے۔ جو چاندنی یعنی رات کے وقت اس پر غالب آتا اور اس کی نینداڑا لیجاتا ہے۔

الفاظ گم دعاؤں کے اور ذہن منتشر
اپنا لہو اچھالیے اب آسمان پر

بیماری میں دوا کے ساتھ دعا بھی لگی ہوتی ہے اوپر کے شعر میں اظہر جس کرب کا اظہار کر رہا ہے اسی نے دعاؤں کے الفاظ بھی گم کر دیئے ہیں۔ اور ذہن کو بکھیر دیا ہے۔ ایسے میں مریض پر ایک جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ

الفاظ نہیں تو اپنا خون آسمان کی طرف اچھالوں کہ اے مرض دینے والے، دیکھ میری حالت!

خون / لہو سے تر، دی گئی لفظیات کی فہرستوں کی ہر لسانی اکائی شاعر کی ذات اور اس کے شعری اظہار کے ربط کو اجاگر کرتی ہے۔

عبدالسلام اظہر سماجی زندگی میں غریب مزدور طبقے کا ایک فرد ضرور تھا اور ساری زندگی وہ ایک خطرناک بیماری کا عذاب بھی جھیلتا رہا لیکن ''انا البحر'' کی غزلیں بتاتی ہیں کہ شعری اظہار نے شاعر کو بڑی امارت و ثروت کا مالک بنا دیا تھا۔ اس کی مملکت میں شعری زبان کا ایک خاص مخاطبہ اور شعری لفظیات کا ایک بامعنی ذخیرہ تھا اور جس پر وہ بلاشرکت غیرے تصرف رکھتا تھا۔ ہاں، کمی تھی تو اتنی کہ اس کی تعلیم و آموزش کی کم حصولی نے اسے اپنے ذخیرۂ الفاظ کو پورے فنکارانہ طمطراق سے استعمال کرنے کا موقع نہ دیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اظہر اگر ایسا ہوتا تو ایسا ہو جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اتنے سرمائے میں اتنا ہی کچھ کرنا اس کے لئے بدا ہوا تھا۔ اس سے زیادہ کچھ اور نہیں، رہے نام اللہ کا!

سلیم شہزاد

# عبدالسلام اظہر اور ''انا البحر''

## سلطان سبحانی

سیریا اور نینوا کی اساطیر کے مطابق سمندر تخریب کاری، تعمیر نو اور زندگی کی تجدید کا ذریعہ ہے۔ یہ ایک طرف تو اپنے طوفانوں سے تمام تہذیبوں کے نشانات مٹا دیتا ہے اور دوسری طرف برباد شدہ زمین پر نئی زندگی کی بشارت دیتا ہے۔ سیریا کی اسطور کی رو سے کائنات کی تخلیق جس دیوی کے بطن سے ہوئی وہ بذات خود سمندر تھی۔ اگر سیریا، بابل و نینوا اور مصر و یونان کی اساطیر کا جائزہ لیا جائے تو سمندر نہ صرف غیظ و غضب، وقت اور تعمیر و تغیر کا مقامِ اتصال محسوس ہوتا ہے بلکہ زندگی، قوموں اور تہذیبوں کے عروج و زوال کی ایک تمثیل بھی بن کر جلوہ نما ہوتا ہے اور غالباً یہی تمثیل عبدالسلام اظہر کی کتاب ''انا البحر'' میں ایک شعری، حسی اور فکری روپ میں موجود ہے جو اساطیری نظام کے بعض پہلوؤں سے فیضیاب ہو کر خود کو نئے عہد سے اس طرح منسلک کرتی ہے کہ محض اُسطور سازی کی روایات کی تصویر (یا ذریعہ تشہیر) نہیں بنتی بلکہ اپنے اس انسلاک سے عصر کی خوبصورتی کو بیان کرنے کا ایک پر اسرار اور محاکاتی انداز ایک تمثال کی طرح دریافت کرتی ہے۔

''انا البحر'' کی شاعری عصر کی سفا کیوں، سفید و سیاہ اور ایک بہیمانہ نظام کے جبر اور قتل و خون کا محاصرہ کرتے ہوئے ماضی کی ان روایات کو تازہ کرنے کی محرک ہے جن کے بطون انسان کے اجتہاد اور عظیم کارناموں سے منور ہیں۔ انسان عظیم کل تھا یا عظیم آج ہے؟ اور دنیا خوبصورت کل تھی یا آج ہے؟ یہ سوالات ایک مفصل بحث کے متقاضی ہیں لیکن انسان اور دنیا کو کل اور آج میں تقسیم کرنا

مناسب نہیں ہے۔انسان بہ ہر حال عظیم ہے اور دنیا بہ ہر حال خوبصورت ،اور اس بات کی توضیح ان الفاظ میں کی جا سکتی ہے کہ دنیا میں ماحول ہمیشہ متغیر رہا ہے جس کے اچھے یا برے اثرات انسان پر مرتب ہوتے ہیں اور ماحول وہ طلسم ہے جو انسان کی شعوری کوششوں سے یا کسی میکانکی طرزِ عمل سے وجود میں نہیں آتا۔اس کا سفر بہت زیریں ،مبہم اور پر اسرار ہوتا ہے اور اس میں تغیر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اسطور کے مطابق کوئی طوفان یا زلزلہ آجائے یا آج کے حالات میں کوئی انقلاب کا نعرہ بلند ہو یا کوئی جنگِ عظیم سر اٹھائے۔

''انا البحر'' میں اسلامی تاریخ ،اساطیر ،واقعات و حکایات کی تمثیلیں موجود ہیں۔جنہیں شاعر نے اپنے دور اور اپنے عہد کے نظام کو بیان کرنے کیلئے بُنی ہیں۔سیلاب نیل سے اس سرزمین پر جو اثرات مرتب ہوئے یا طوفانِ نوح سے جو تغیر ہوا اس کے باعث ایک خوشگوار ماحول وجود میں آیا اور یہ بات صحیح محسوس ہوتی ہے کہ دنیا کے تغیر و تبدل میں سمندر سے ایک کردار کی حیثیت سے کام لیا گیا ہے۔اسطورات (اساطیر) کے مطابق سیریا کی دیوی مانو ہو یا یونانی دیو مالا کا پوٹاش یا مصری دیو مالا کا رع ۔یہ سب انسانی عقائد و تصورات کے زینوں پر کھڑے حقیقت اور گمان کے تانے بانے بُن کر ایک فکری نظام کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں اور ادب میں شاعری یا کہانی ان سے فیض اٹھا کر انہیں نئے عہد پر منطبق کرتی ہے اگرچہ بعض فنکار اپنی کم علمی کی بنیاد اساطیر کو مالِ غنیمت سمجھ کر ''اساطیر برائے اساطیر'' کے وتیرے پر چل کر اس متحرک خزانے کو گھورے میں تبدیل کر دیتے ہیں لیکن اس حرکت سے اساطیر نہیں بلکہ خود فنکار مجروح و مشتبہ ہوتا ہے کیونکہ اساطیر کے ذریعے عصر کو سینچنا الگ عمل ہے اور اساطیر کو نزلہ وزکام ثابت کرنا الگ۔عصری ادب میں اسطور نگاری عام ہے لیکن جو اسطور مفاہیم کے دروازے وا





نہ کرے وہ بیکار و عبث ہو جاتی ہے اور سارا نظام مختل۔

عبدالسلام اظہر کی کتاب کا نام ''انا البحر'' فنکار کی ذات کا اعلامیہ ہے علامتی حیثیت کا حامل ہے اس نام کو دیکھ کر وہ اساطیر پَر پھڑ پھڑاتی ہیں جن کا تذکرہ پچھلی سطور میں کیا جا چکا ہے لیکن ان سطروں کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اظہر کی شاعری صرف دائرۂ اساطیر میں ہے۔اظہر نے صرف خاص خاص مقامات پر ان سے چابک کا کام لیا ہے کیوں کہ وہ عصری فنکار ہے اور اساطیر ایک طرح سے لوحِ طلسم ہے جس کا عصری رویوں سے انطباق ایک خاص عمل کے ذریعے یا کسی خاص موضوع کے تحت ہی ہو سکتا ہے تا کہ ان کے درمیان کسی قسم کی مقادمت نہ ہو سکے۔

یہ رسم اب بھی ہے زندہ مرے قبیلے میں ۔۔۔ خود اپنے بہتے ہوئے خون سے وضو کرنا
کشتیاں پھونکنا دریا کے سفر میں رہنا ۔۔۔ اس قبیلے کی تو فطرت ہے بھنور میں رہنا
اک سر بلند کیا ہوا شہرِ یزید میں ۔۔۔ نکلی چمکتے نیزوں کی بارات ہر طرف
نیزے،صلیب،آگ کی چادر،لہو کی موج ۔۔۔ سچ بولئے تمام اذیت خریدیئے
مرا قبیلہ سپاہی نہیں مجاہد ہے ۔۔۔ کسی بھی حال میں تلوار بیچتا ہی نہیں
اس صدی کا لمحہ لمحہ صاحبو برزخ بکف ۔۔۔ آگ کے شعلوں سے ہے لکھا ہوا چاروں طرف
حجرے کو اپنے چھوڑ کے سیلابِ ظلم میں ۔۔۔ ہو جاتے تھے جو آہنی دیوار کیا ہوئے

یہ اشعار اسی شاعر کے ہیں جس نے سمندر ہونے کا دعویٰ کیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ فنکار کی ذات بھی ہزاروں طوفانوں سے مملو ہے جو تہہ دار ہونے کے باعث کسی بھی روپ میں متشکل ہو سکتی ہے۔

تری طرف میں اڑوں گا نازک پروں سے اپنے ۔۔۔ مگر حدِلا مکاں سے مجھ کو پکار دینا
نہیں ہے مشکل ہمارے دستِ ہنر کے آگے ۔۔۔ سیہ چٹانوں پہ عکس کوئی ابھار دینا
نہ جانے کون سا موتی مرے وجود میں ہے ۔۔۔ کہ علم و فن کا سمندر کھنگالتا ہے مجھے

اگر ''انا البحر'' کے بارے میں یہ کہا جائے کہ اس نام کے پیچھے کوئی انانیت کارفرما ہے تو درست نہ ہوگا۔ اس کتاب کی شاعری کے اندر جو ''مَیں'' ہے۔ وہ فنکار کی اپنی ذات ضرور ہے لیکن یہ ذات ہمہ رنگ ہے اور ہمہ رنگ ہونے کے باعث کبھی پرندہ، کبھی سمندر، کبھی فرد، کبھی مجاہد، کبھی قبیلہ اور کبھی عوام بن جاتی ہے اور یہ وصف کسی فنکار میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ اپنے اندر چھپے ہوئے ''مَیں'' کی شناخت اور اس کی تسخیر کے مراحل سے گذر چکا ہوتا ہے۔

''انا البحر'' کی شاعری پر کہیں کہیں اُداسی یوں غالب ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی موسم بغیر کسی ہمہمے کے آ گیا ہو۔ اگرچہ اداسی کسی بھی مسئلے کا حل نہیں ہے اور نہ ہی کسی مرض کی دوا۔ مگر یہی اداسی جب تخلیق میں تشکل کے زینوں سے تراشیدہ اتر کر آتی ہے تو اس کے اندر ایک سیمابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور ایک ایسا موسم چھا جاتا ہے جس میں آگ کا رنگ بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ عبدالسلام اظہر کی اداسی قنوطیت کی سرزمین سے بہت الگ ایک چھوٹے سے جزیرے کی مانند ہے جہاں بہت سارے خواہشوں کے پرندے لہولہان ہونے کے باوجود پرواز کر رہے ہیں اور یہ ایک متحارِب جذبہ ہے جو اپنی قدر و قیمت رکھتا ہے۔

اک قطرہ اوس کے لئے پھرتے ہیں شہر شہر — ہائے وہ لوگ جن پہ سمندر سبو ہوئے

پہلے ہوائے شام نے لکھا تمہارا نام — پھر اس کے بعد سارے مناظر لہو ہوئے

جاتے جاتے رات اک محتاط لڑکی کی طرح — سب ستارے اپنے آنچل میں چھپا لے جائے گی

مضطرب رکھتا ہے سورج کو، ہوا کو اظہر — ایک پتے کا ابھی شاخِ شجر میں رہنا

نئی شاعری کے تناظر میں اگر اسلوب کی پیشکش کو دیکھا جائے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ ابتدا میں کافی حد تک تنوع رہا ہے۔ لیکن متاخرین نے بعض مفاخرت کیلئے سارے اسالیب کو خلط ملط کر کے ان کے بطن سے نئے اسلوب دریافت کرنے کی آسان کوششیں شروع کیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلوب کا





دریا وہیں ٹھہر گیا اور لب و لہجہ کی یکسانیت کی موج چل پڑی۔ اس یکسانیت کو ''عصری یکسانیت'' کہنا مناسب نہیں ہے کیوں کہ ان میں مضامین کی تکرار محسوس ہوتی ہے۔ اس طرح نئی شاعری کا تمام عمدہ مواد مختلف شاعروں کے یہاں منقسم اور منتشر نظر آنے لگا اور یہ بارش اس شدت سے ہوئی کہ مواد اور اسلوب کی پامالی کی حد تک آ گئے۔ اس سلسلے میں بہت سے شاعروں نے احتیاط بھی برتی۔ انہوں نے ماضی قریب کے مواد، اسالیب اور تجربوں سے استفادہ ضرور کیا لیکن کسی اور کی بجائے خود کو بیان کیا۔ عبدالسلام اظہر بلا شبہ ان میں سے ایک ہیں۔ ان کے اشعار دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم اور جدید شعری ادب کا محاصرہ کرنے کے بعد انہوں نے اپنا لہجہ خود دریافت کیا ہے۔ ایک ایسا لہجہ۔ جیسے کوئی ہزاروں سال پرانی کہانی سنا رہا ہو لیکن سارے واقعات آج کا تعارف پیش کر رہے ہوں۔ اس کے انداز میں ایک داستانی تمثال گری اور عصر کی فریاد ہے جن کے ارتباط سے ایک بہت ہی گمبھیر اور پُرسکون آواز ابھرتی ہے۔

اسے خبر نہیں میں کٹ چکا ہوں اندر سے
وہ چاہتا ہے مرا پیرہن رفو کرنا

عبدالسلام اظہر کی شاعری ماضی سے عصر تک اور عصر سے منضبط سچائیوں تک ایک ایسا ذہنی سفر ہے جو اذیّت ناک ہونے کے باوجود خنداں، خاموش اور خوبصورت ہے۔

ہمارے واسطے کوئی شفیق ہاتھ کہاں
سروں پہ سایہ شمشیر آبدیدہ ہے

سلطان سبحانی

# چراغِ کشتہ

ڈاکٹر اشفاق انجم

سلام اظہؔر شاید پیدائشی بدنصیب تھا۔ مسرتوں اور شادکامیوں نے کبھی اس نے منہ نہیں لگایا۔ ساری زندگی محنت ومشقت کرتا رہا اور خون تھوکتا رہا۔ اس پر مزید ستم یہ کہ اس کے اس کے مدقوق جسم کو بیحد روشن اور تیز وطرار ذہن بخشا گیا تھا۔ جیسے گرم توئے پر سیماب رکھ دیا گیا ہو۔ اس کا ذہن خلد کی عظیم وسعتوں میں پرواز کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بال وپر موم کے ملے تھے۔ اپنی اس بیچارگی پر وہ رو پڑتا تھا۔ اس کے اندرون کا لاوا پھوٹ بہنا چاہتا تھا۔ لیکن کہیں کمزور سطح نہیں مل رہی تھی۔ موسم پر موسم تبدیل ہوتے رہے اور اس کی سخت مٹی آہستہ آہستہ نم ہوتی گئی اور ایک دن یہ لاوا تمام بندشوں کو توڑ کر صفحۂ قرطاس پر بکھر گیا۔ شعر کہہ کر اسے کچھ آسودگی محسوس ہوئی اور پھر وہ اسی مشغلے میں کھو گیا۔ یہاں بھی بدنصیبی نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ جب پہلی بار اس نے مشاعرے میں اپنی غزل پیش کی تو مجاوران اور سجادہ نشینانِ ادب کے کان کھڑے ہوگئے سب ایکدوسرے کا منہ تکنے لگے کہ ''ایں کیست؟'' اور آخر میں ان کی نجی محفلوں سے فقویٰ جاری ہوگیا کہ یہ بے ڈھنگا سا نوجوان ایسی خوبصورت غزل کہہ ہی نہیں سکتا۔ یقیناً یہ کسی استاد شاعر کا کمال اور مالِ غنیمت ہے۔

انہیں مجاوروں میں سے ایک صاحب نے مجھے آگھیرا اور بڑے عجیب لہجے میں سخت سست کہنے لگے۔ میں نے سبب پوچھا تو چیخ کر بولے ''تم نالائق ہو، ابھی تم بھی اپنے استاد (ادیبؔ صاحب) کی روش اپنا رہے ہو۔ یہ کوئی اچھی بات





نہیں ہے۔ یاد رکھو! بہت پچھتاؤ گے۔'' میں نے حیران ہوکر کہا: ''جناب! صاف صاف کہئے، مجھ سے ایسا کیا قصور سرزد ہوگیا ہے؟'' فرمانے لگے: ''تمہیں اس جاہل کو ایسی خوبصورت غزل دیتے ہوئے افسوس نہیں ہوا؟'' میں نے کہا ''کون جاہل؟''۔۔۔اور کیسی غزل؟'' فرمایا: ''وہی عبدالسلام اظہؔر اور یہ غزل۔ اتنا کہہ کر انہوں نے ایک شعر بھی سنا دیا۔ شعر سن کر واقعی میں چونک گیا۔ بڑا خوبصورت شعر تھا۔ جی خوش ہوگیا۔ ان صاحب سے خدا رسول کی قسمیں کھا کر کہا کہ غزل تو کیا، اس میں ایک لفظ بھی میرا نہیں ہے۔ اور میں نے اس شاعر کا نام بھی پہلی بار سنا ہے۔'' وہ صاحب کچھ یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں رخصت ہوگئے۔ لیکن میں دیر تک اس شعر کو دہراتا رہا اور لطف لیتا رہا۔

اس واقعے نے دل کر ابھارا کہ اظہؔر سے ملا جائے۔ اتفاق سے وہ خود آکر مجھ سے ملا اور ان مجاوروں کی شکایت کرنے لگا۔ میں نے تسلی دی کہ ابتداء میں ادیبؔ صاحب پر بھی یہی الزام تھا اور مجھے بھی ماخوذ کیا گیا تھا۔ تم اپنا کام کرتے رہو۔ ان لوگوں کے چکر میں نہ پڑو۔ لیکن اظہؔر اس بات سے بیحد دل گرفتہ اور مایوس تھا۔ بحث وتکرار اور لڑائی بھڑائی کے قابل تو تھا نہیں۔ اشعار میں اپنا بخار نکالنے لگا۔ روزانہ ایک دو غزل کہتا اور آکر مجھے سناتا۔ اس کی ہر غزل میں اس قسم کا کوئی نہ کوئی شعر ضرور ہوتا۔

اظہؔر بصیرتوں کے پروں سے اُڑا ہوں میں
حیرت ہے کیوں زمین کو میری اڑان پر

دھیرے دھیرے یہ طوفان تھمتا گیا لیکن اس ابتدائی تجربے نے اظہؔر کے مزاج میں جڑ پکڑ لی اور وہ آخر دم تک اس احساس کا شکار رہا کہ لوگ اس سے حسد کرتے ہیں اور اس کی بیماری اور ناداری سے نفرت کی جاتی ہے۔ اس خیال

کے ردّعمل کی صورت میں وہ اپنے آپ اور اپنی شاعری سے جنون کی حد تک محبت
کرنے لگا اور وہ اپنے گرد اک حصار بننے لگا۔ اور پھر وہ اسی حصار میں قید خود کو عظیم
شاعر سمجھ کر خوش وخرّم رہنے لگا۔ اس خود ساختہ مسرّت نے اسے خود پرستی میں مبتلا
کر دیا۔ اب وہ کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ یہ جذبۂ خود پرستی ہی تھا جس نے اس
سے ایسا شعر کہلوایا۔

نئے عذاب تعاقب میں ہوں گے ہر لمحہ
پیمبری ہے یہاں حرفِ معتبر لکھنا

اور اس کے مجموعۂ کلام کا نام ”انا البحر“ بھی اس کے اسی مزاج کی نمائندگی
کرتا ہے۔

اظہؔر کو اپنے اس مزاج کا خمیازہ اس طور پر بھگتنا پڑا کہ کسی سے بھی اس کی
دوستی اور تعلقات زیادہ عرصہ برقرار نہ رہ سکے۔ وہ لوگوں کے ساتھ مخلص نہیں تھا۔ اس
لئے خود بھی خلوص کو ترستا تھا۔ لیکن وہ بھی کیا کرتا، تنہائی اس کا مقدر بن چکی تھی۔

اس شہر میں اظہؔر سے تعلقات اور دوستی کے دعوے دار تو بہت مل
جائیں گے لیکن میرے سوا قربت اور رازداری کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکتا۔ اس کی
ساری زندگی میرے سامنے ایک کتاب کی طرح کھلی رکھی ہے۔ بہت کچھ لکھنا چاہتا
ہوں، جی چاہتا ہے کہ اس کی تمام خوبیوں اور خرابیوں کو کاغذ پر منتقل کر دوں لیکن
ایک عجیب سے دکھ اور شرمندگی کا احساس ہوتا ہے کہ ہم نے بھی اس کے ساتھ کچھ
اچھا سلوک نہیں کیا۔ اسے اپنے علاج کیلئے بار بار ہاتھ پھیلانے پڑے۔ ایسا نہیں
ہے کہ لوگوں نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ کیا، لیکن ناکافی۔ وہ بھی خوددار
اور خود پرست تھا۔ جب بھی ہاتھ پھیلائے اسے اپنے اندرون میں کوئی شئے چٹخنے
ٹوٹتی محسوس ہوتی، اس ہاتھوں میں لرزہ آجاتا اور وہ اپنی بیماری کو اس گداگری پر ترجیح





دیتا اور علاج معالجہ سب ترک کر کے بیٹھ جاتا لیکن بھوک اور بیماری اسے پھر مجبور
کر دیتی۔ وہ اپنی اس حالت سے تنگ آچکا تھا مرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ شاید اسی لئے
اظہؔر نے بہت پہلے کہا تھا۔

اندر کی آگ سب کو کہاں راس آتی ہے
کچھ لوگ کیمیا نہ ہوئے خاک ہو گئے

اندر کی یہ آگ مجاؔز، شکیؔب جلالی، نشاؔط شاہدوی اور میؔراجی کی طرح
اظہؔر کو بھی راس نہیں آئی اور یہ بھی احساس کے دہکتے شعلوں میں تپ تپ کر کندن بننے
کی تمنا میں خاک ہو گیا۔

میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ جب کسی نحیف ونزار فنکار کو اعلیٰ و
حساس اور تیز وطرار دماغ مل جاتا ہے تو جسم اسے برداشت نہیں کر پاتا اور بہت
جلد ان کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے اور اظہؔر تو ازلی کمزور تھا اس لئے یہ رشتہ داری تیس برس
سے زائد نہ نبھ سکی۔

تیس برس کی عمر، کوئی خاص عمر نہیں ہوتی۔ یہ تو بچپن کے گذرنے اور
جوانی کی آمد کے احساس کا زمانہ ہوتا ہے۔ شعور واحساس ان دونوں کے علاحدہ
علاحدہ شناخت قائم کرنے میں مصروف ہوتے ہیں، یہ راستے پر چلنے کا نہیں بلکہ راہ
کو متعین کرنے کا وقت ہوتا ہے۔ لیکن اظہؔر کی زندگی میں یہ وقت شاید بہت پہلے ہی
آگیا تھا اور اس کی فطری ذہانت نے اسے ایک راستہ بھی دکھلایا تھا اور وہ تعلیم و
تربیت سے دور شعر وادب کے دشوار گذار راستے پر چل پڑا تھا۔ اس نے گلابوں کی
آرزو میں اپنے تلوے لہولہان کر لئے اظہؔر نے اگرچہ راستے میں ہی دم توڑ دیا لیکن
اس کے لہو کا ایک ایک قطرہ اس راستے پر جگنو کی طرح چمک رہا ہے۔

اظہؔر کی ساری زندگی درد وکرب اور بے کسی میں گذری۔ غربت و

افلاس اور بیماری نے اسے نفرت و حقارت کے سوا کچھ نہ دیا۔ اور جب باہر کی دنیا نے اس پر اپنے تمام دروازے بند کر دیئے تو اس نے اپنے اندر ایک بیحد خوبصورت بستی بسالی۔

بیماری، بے بسی اور بیچارگی نے اظہر کو کچل کے رکھ دیا تھا۔ اس کا جسم بری طرح پائمال ہو چکا تھا لیکن ان مصائب نے اس کے دماغ کو بیدار اور عشق نے اس کے دل کو روشن بھی کر دیا تھا اور قدرت نے اسے قوتِ گویائی عطا کی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اظہر نے اپنے جمالیاتی احساسات کو بڑی خوبصورتی کیساتھ نہایت لطیف لفظیات کے حریری ملبوس میں پیش کیا ہے۔ اس عمر میں ایسے منجھے اور نکھرے ہوئے جمالیاتی شعور کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

یاقوت لبوں کا پہلا لمس اظہر کی زندگی کا سب سے قیمتی لمحہ تھا جس کی حلاوت نے تمام تلخیوں کو مٹا دیا اور وہ اس کی لذتوں میں خود فراموشی کی حد تک پہنچ گیا اور یہ دوسرا حصار تھا جو اظہر نے اپنے گرد قائم کر لیا۔ اس زمانے میں اس کو نوکِ قلم نے بیحد حسین اور روشن ہیرے تراشے ہیں۔

رکھ دیئے تھے کبھی اس پہ خوشبو نے لب
عمر بھر اک ستارہ رہا ہاتھ پر!!

خدایا ریشمی زلفوں کے پیچ رکھنا اُسے
جلاتا ہے جو سرِ شام اک دیا مجھ میں

گلاب چہرہ، سمندر بدن سی اک لڑکی!
سکھا گئی ہے مجھے رات کا بھنور لکھنا

سلگتے دشت میں تازہ گلاب کی صورت
کسی کے لمس کا لمحہ کھِلا رہا مجھ میں

نغمہ، گلاب، تتلی، ستارہ، صبا ہے وہ!
یا برگِ گل پہ لکھی ہوئی اک دعا ہے وہ

اس کے خیال سے ہے مری شاخِ جاں میں نم
آنکھوں میں روشنی کے طرح بس گیا ہے وہ

اظہر نے ایسی محبت اور حلاوت اپنی زندگی میں پہلی بار پائی تھی۔ وہ اس میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس لمس کی حلاوت نے اسے ایک اور لذت سے آشنا کر دیا۔





اور اس سمندر کی زبردست موجیں اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر ایک ایسے جزیرے میں چھوڑ آئیں جہاں ریت اور دھوپ کی تپش نے اس کا رہا سہا خون بھی چوسنا شروع کر دیا جس کے خیال سے اظہر کی شاخِ جاں میں نمی تھی جس کے نور سے اس کی آنکھیں روشن تھیں اور جس نے اسکے اندر ایک دیا جلایا تھا۔ اس دیئے سے ایک لو پھوٹ نکلی اور اظہر کا سارا جسم اندر ہی اندر سلگنے پگھلنے لگا۔ اس کے اندر کی خوب صورت بستی میں زلزلہ آ گیا۔ تمام خواب کھنڈر ہو گئے۔ ایک بار پھر وہ حقائق کی سنگلاخ وادیوں میں آ گیا اور اس کا گلاب سے لہجہ زہریلا ہو گیا۔ ایک بے نام سا درد پھر اس کے سینے میں سانسیں لینے لگا۔ تمام زخم دوبارہ ہرے ہو گئے اور وہ اپنے اندر ایک بار پھر بکھر گیا۔

لکھ دو ہمارے درد کی شدت عجیب تھی
کیسے کریں بیاں کہ الفاظ ہی نہیں

میں تو سمجھ رہا تھا کہ سب زخم بھر گئے
پھر درد سانس لینے لگا موج کی طرح

اظہر کے زخموں کا پھر سے ہرا ہو جانا بہتر ہی ثابت ہوا اور اس بے نام درد نے اس کو ایک نئی زندگی بخش دی۔ اب وہ اپنی ذات کے تمام حصاروں کو توڑ ایک وسیع دنیا میں پہنچ گیا جہاں اسے ہر گام ایک نئے طلسم سے دوچار ہونا پڑا۔ ان طلسمات نے اس کے شعور و فکر کے تمام دریچے وا کر دیئے۔

بکھری جو ٹکڑے ہو کے مری ذات ہر طرف
آئے نظر انوکھے طلسمات ہر طرف!

اب اظہر ان طلسمات کو کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ آہستہ آہستہ تمام راز اس پر منکشف ہونے لگے۔ اس مقام پر اس کی شاعری اس راستے پر مُڑ جاتی ہے جہاں سے آفاقی شاعری کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں۔ چونکہ اس کے دماغ میں کڑی دھوپ اتر چکی تھی۔ اس لئے جہاں تک اس کی نگاہیں پہنچتی تھیں اسے

روشنی ہی روشنی نظر آتی تھی۔اس کے دل ودماغ میں غیر محسوس طور پر ایک اجالا سا پھیلنے لگا جس کے طفیل اب وہ اشیاء اور جذبات دونوں کے اندرون میں جھانکنے لگا یہیں سے اپنے ذاتی درد وغم پر کائناتی درد وغم کے سائے حاوی ہونے لگے۔اب دوسروں کے اشکوں کی تپش اور آہوں کا دھواں بھی اسے محسوس ہونے لگا اور وہ اپنے اظہار کا ایک نیا زاویہ مانگنے لگا۔

اظہار کے وہ زاویے ذہنوں کو بخش دے
روحوں کی چیخ کو جو ابھارے زبان پر !!

اس مقام پر آ کر وہ نہ صرف روحوں کی چیخیں سننے لگا بلکہ ان کے اسباب تک بھی اس کی نگاہیں پہنچنے لگیں۔

انسان کے حق میں اہلِ سیاست یا مفلسی
کچھ فیصلہ تو ہو کہ خطرناک کون ہے؟

قدرت نے لالۂ خودرو کی طرح اظہؔر کی ذہنی تربیت بھی اپنے ہاتھوں سے کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا شعور پختہ اور نگاہیں عمیق تھیں۔اس کا مطالعہ بیحد وسیع رہا اور یادداشت غضب کی تھی۔ایک بار جو دیکھ لیتا اور جو کچھ سن پاتا اس کے ذہن پر نقش ہو جاتا تھا۔اور پھر یہی نقوش اس کے تجربے کی سان پر چڑھ کر ایک نئے اور نتیجہ خیز روپ میں صفحۂ قرطاس پر ابھرتے تھے۔اظہؔر مظلوم تھا۔اس لئے ہر ظلم اور زیادتی پر وہ چاہے جہاں اور چاہے جس کے ساتھ ہو چیخ پڑتا تھا۔اسے اس بات کا بھی شدید غم تھا کہ اس کی چیخیں صحرا کی صدا کی طرح ضائع ہو جاتی ہیں۔اس زیاں پر وہ بجھ کر رہ جاتا تھا۔اور اپنے ہنر کو رائیگاں تصور کرنے لگتا تھا۔اسے لگتا تھا جیسے کسی نے اس کے ہاتھ شانوں سے قلم کر دیئے ہوں۔اس کے نظریات اور حوصلوں میں دراڑیں پڑنے لگتیں۔



انا البحر
عبدالسلام اظہؔر

مَیں نے لکھا تھا رات سے لڑنا ثواب ہے
شانوں سے مرے ہاتھ قلم کر گیا کوئی

ہم ہوا کے زور سے لڑنے کو لڑ جاتے مگر ،
خواب کی شاخوں پہ ظالم ایک بھی پتہ نہ تھا

سلام اگر چہ شعائرِ دین سے دور تھا لیکن اپنی اصل سے جڑا ہوا تھا اسلام اور مسلمانوں کی زبوں حالی اور تباہی اسے بھی بیچین رکھتی تھی۔ملک میں ہونے والے ہر فساد میں وہ خود کو قتل ہوتا ہوا محسوس کرتا تھا۔ایسے عالم میں وہ بھی دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیتا ہے۔

ربِّ عظیم میرے چراغوں کی لاج رکھ!
قبضہ جما رہی ہے سیہ رات ہر طرف

اظہؔر صرف دعا پر ہی بس نہیں کرتا بلکہ اپنی تباہی و بربادی کے اسباب بھی تلاش کرتا ہے اور بالکل درست نتیجے پر پہنچتا ہے۔

شاخوں سے منسلک تھے تو جانِ بہار تھے !
شاخوں سے منحرف ہوئے خاشاک ہو گئے
اِک قطرہ اوس کے لئے پھرتے ہیں شہر شہر
ہائے وہ لوگ جن پہ سمندر سبو ہوئے
اِک چھت کے نیچے رہ کے بھی اِک دوسرے کا خوف
آسیب کا ہے سایہ، مرے خاندان پر

کتنا صحیح تجزیہ ہے۔آج قومِ مسلم کی تباہی کا سبب یہی ہے کہ ہم اپنی

اصل سے ہٹ گئے ہیں۔ ہم میں اتحاد و اتفاق باقی نہیں رہا۔ حتیٰ کہ ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والے بھی ایک دوسرے سے بدظن اور خوف زدہ ہیں۔

اتنا کچھ ہونے کے باوجود بھی وہ پُر امید تھا۔ اسے اپنی روایتوں پر فخر اور اپنے عزم و اعتماد پر بھروسہ تھا۔ اسے اپنے قبیلے کی شجاعت پر ناز تھا۔ جو ساحلِ پر کشتیاں جلا دینے کا حوصلہ رکھتا ہے، جو سَر دے سکتا ہے مگر تلوار نہیں کیوں کہ

............

مِرا قبیلہ سپاہی نہیں مجاہد ہے — کسی بھی حال میں تلوار بیچتا ہی نہیں
یہ رسم اب بھی ہے زندہ مرے قبیلے میں — خود اپنے بہتے ہوئے خون سے وضو کرنا

اس اعتبار کا سہارا بھی اظہر کے لئے بہت تھا۔ اسی چراغ کی روشنی میں وہ حقائق سے نبرد آزما اور مفروضوں کی زہرناکی سے محفوظ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مفروضوں پر زندگی نہیں گذاری جاسکتی۔

میں مفروضے بسالوں اپنی سانسوں میں اگر اظہر
حقائق کی صدی کا یہ سفر دشوار ہوجائے

مسافرنوازی کے لئے سفر شرط ہے اور اظہر کا قبیلہ تو کبھی بھی کسی ایک ٹکڑے کا اسیر ہو کر نہیں رہا۔ ساری زمین اس کے لئے اپنی بانہیں پھیلائے ہوئے ہے اگر ایک ٹکڑا چھن گیا تو کیا۔

ساری زمیں ہے آپ کی اٹھ کر سمیٹیئے!
ٹکڑا جو کھو گیا ہے تو کچھ غم نہ کیجئے





اظہر کے اس یقین میں بڑی پختگی تھی۔ اسے نامساعد حالات سے ایک ضد سی ہوگئی تھی۔ وہ مایوس ہونے کی بجائے آمادۂ پیکار نظر آتا ہے۔ اور چیخ چیخ کر کہتا ہے۔

ابھی دماغ سلامت ہے میرا ہم سفرو! — میں تپتے صحرا میں دریا کا خواب دیکھوں گا

اظہر مرگیا ہے.................. لیکن اس کا خواب زندہ ہے اور جب تک تپتے ہوئے صحرا میں دریا رواں نہیں ہوجاتا تب تک زندہ رہے گا..........!!

ڈاکٹر اشفاق انجم

# "............اضطراب دریا کا"

شبیر ہاشمی

عبدالسلام اظہر جو معاشی اور جسمانی اعتبار سے انتہائی کمزور لیکن ذہنی اعتبار سے دانشور طبقے کا فرد تھا۔ زندگی کی تپتی ہوئی دھوپ میں پا برہنہ سفر کرتے کرتے اندر سے بالکل کٹ چکا تھا۔ اس ذاتی کرب نے اسے احساس کی غیر معمولی شدّت سے روشناس کیا۔ حالات کی ستم رسیدگی، زندگی سے لحہ بہ لحہ دوراور موت سے قریب تر ہونے کے شدید احساس نے اس کی شاعری کی فضا کو المناک بنا دیا۔ حزن، مایوسی، اکتاہٹ اس کی شاعری کے ایسے اساسی رجحانات ہیں جو محض اس کی نفسیاتی وارداتوں کی ہی نہیں بلکہ اس کے وجود کی سچی تہہ داریت کا بھی پتہ دیتے ہیں۔ اس کے یہاں وقت کی تلخیوں اور تشنہ کامیوں کے اثرات ایک غم انگیز یاسیّت کی صورت میں تو ملتے ہیں لیکن بے فیض قسم کی قنوطیت اور لایعنیت تک نہیں پہنچتے۔

نہ آہٹوں کا تسلسل نہ کچھ صدا مجھ میں ۔۔۔ عجب سکوت کا صحرا اتر گیا مجھ میں
سلگتے دشت میں تازہ گلاب کی صورت ۔۔۔ کسی کے لمس کا لمحہ کھِلا رہا مجھ میں
سلگتی ریت میں تلوے لہو لہو کرنا ۔۔۔ پھر اس کے بعد گلابوں کی آرزو کرنا
اسے خبر نہیں میں کٹ چکا ہوں اندر سے ۔۔۔ وہ چاہتا ہے مرا پیرہن رفو کرنا

اظہر نہ اپنی ذات میں گم ہو کر ماحول کو نظر انداز کرتا ہے اور نہ ماحول میں گم ہو کر اپنی ذات اور اس کے مسائل سے بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ عام انسانوں کی طرح اپنے اطراف کی زندگی کی ناہمواریوں اور ناانصافیوں کو دیکھتا ہے اور عام





انسانوں کی طرح ہی اپنے ردّعمل کا اظہار بھی کرتا ہے۔ اس کی سماعت اس کے اطراف میں ٹوٹنے والوں کی صدائیں سنتی ہے اور بصارت اس صدی کے ایک ایک لمحے کو برزخ بکف دیکھتی ہے۔ وہ مکان مکان میں ہونے والی جنگوں اور شہر میں بگولوں کی شہر یاری کا گواہ ہے۔ وہ تپتے ہوئے صحرا میں دریا کے خواب اور تنکوں کی سخت لمحات و بپھرے ہوئے طوفانوں سے نبرد آزما دیکھنے کا آرزومند ہے۔ وہ غلبۂ رہزن پرست کے انجام سے خوب واقف ہے۔ اسے اس بات کا دکھ ہے کہ ہر بوالہوس حسن پرستی کو شعار بنا رکھا ہے۔

انسانی رشتوں کی پامالی اور اجتماعی دکھوں کا احساس، سماج سے اس کی گہری اور بامعنی وابستگی کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ اپنے محسوسات و تجربات کے ہر اظہار میں بھی نہایت درجہ مہذب ہے۔ اس لئے زندگی کی تنقید میں اس کی احتجاجی لہجہ چیخ یا نعرہ نہیں بنتا لیکن وہ جدلیاتی طرزِ احساس تک ضرور پہنچتا ہے۔ اس کے اشعار میں "عالم پناہ"، "ظلِ الہٰی"، "عزت مآب"، "عالی جاہ" جیسی علامتوں کا برتاؤ اسی طرزِ احساس کا غماز ہے لیکن اس کے باوجود اظہر کسی نظریاتی دائرے میں قید نہیں ہوتا۔

غزل کی لطافتوں اور نزاکتوں سے بھی اظہر خوب واقف تھا۔ وہ روایتوں کی پاسداری کرتے ہوئے عصر حاضر کے ساتھ چلتا رہا۔ یوں بھی ہوتا رہا ہے کہ اکثر شعراء نئے شعری اسلوب کو محض تقلیدی طور پر اختیاری کر لیتے ہیں۔ وہ جدید حسیّات اور اس کے شعور و ادراک سے قطعی نابلد ہوتے ہیں۔ جہاں کسی نے گھر، بچہ، کھلونا، تنہائی، کربلا اور اس کے متعلقات کو برتا خود بھی محلِ استعمال بدل بدل کر انہی لفظیات کو سطحی طور پر برتنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کوششیں سستی شہرت اور وقتی "شورِ داد" سے نواز سکتی ہے لیکن یہ شاعری دلوں میں جگہ بنانے اور ادب میں مقام پانے سے محروم ہی رہتی ہے۔ اظہر ادب میں اور موجودہ

عہد میں ہونے والی تبدیلیوں اور اس کے مسائل سے واقف تھا۔ جدید رجحانات اس کے یہاں تقلیدی طور پر نہیں بلکہ تخلیقی سطح پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کی شاعری فکری اور فنی سطح پر اپنے قاری کے لئے بیحد متاثر کن بن جاتی ہے۔ اپنے تجربوں اور جذبوں سے شاعر کی پرخلوص وابستگی موضوع کے اظہار میں اس کی مناسبت سے اشارات و کنایات، زبان و بیان اور تہہ داریت کو وضع کرتی ہے۔ اظہؔر کی زبان و بیان اگر چہ بہت سادہ ہے لیکن اس میں ایک مخصوص قسم کی تمکنت کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اظہار و بیان کی اسی تمکنت نے اس کی شاعری میں وہ قوت پیدا کی جو اس کی خودداری اور انا کو مجروح ہونے سے بچاتی رہی۔

اظہؔر کا دل روشن اور فرد کی محبتوں سے معمور تھا۔ اس نے ایک باضمیر، خوددار اور خودشناس شاعر کی حیثیت سے، مصلحت سے بے نیاز اظہارِ صداقت کو اپنی مخصوص انفرادیت کا حصہ بنادیا اور یہی خوبی اظہؔر کی شاعری کی پہچان بن گئی۔

شبیر ہاشمی





○

پنجے میں زرد رُت کے ہے ڈال ڈال ربّی
پیڑوں کو بخش دینا پھر سبز شال ربّی

پھر پختہ کردے نسبت اُمّی لقب نبیؐ سے
پھر بخش دے دلوں کو سوزِ بلالؓ ربّی

تو ہے کریم اتنا میری خطاؤں پر بھی
رکھی ہے آج تک جو روزی بحال ربّی

تیرے سوا کسی کے آگے جھکے نہ یہ سَر
بس تیرے آگے پھیلے دستِ سوال ربّی

رنگین بستیاں ہیں عرفاں دے نیک و بد کا
بحرِ ہوس سے میری کشتی نکال ربّی

بس اِک ترا سہارا ہم کو بچائے ورنہ
ہے ارضِ ہند ہم کو کوفہ مثال ربّی

جذبات کو وجود تلک یوں رسائی دے
رگ رگ میں اس کے دل کا دھڑکنا سنائی دے

تجھ سے بچھڑ کے جرم تھا پھولوں کو دیکھنا
اب جو سزا دے آنکھوں کو وہ انتہائی دے

نافذ ہوا ہے کیسا یہ آئینِ احتیاط
اپنا مکان بھی ہمیں زنداں دکھائی دے

خوف وہوس سے پاک کوئی ایسی رُت ملے
جو تتلیوں کو ''حوصلۂ پرکشائی'' دے

قطرے کی خود شناسی نے اعلان کردیا
''زنجیرِ موج موج'' سے مجھ کو رہائی دے

اظہرؔ! یہ باڑھ تیروں کی ممکن ہے ایک روز
پھر سبز طائروں کو فلک آشنائی دے





سلگتی ریت میں تلوے لہو لہو کرنا
پھر اس کے بعد گلابوں کی آرزو کرنا

اسے خبر نہیں میں کٹ چکا ہوں اندر سے
وہ چاہتا ہے مِرا پیرہن رفو کرنا

یہ مشغلہ نہیں مرہم ہے دل کے زخموں کا
تمام رات ستاروں سے گفتگو کرنا

یہ رسم اب بھی ہے زندہ مِرے قبیلے میں
خود اپنے بہتے ہوئے خون سے وضو کرنا

برس کے رہ گئیں شمشیریں میرے شانوں پر
میں چاہتا ہی تھا آئینہ روبہ رو کرنا

''خوش روحِ بزرگاں'' نیا سلطان کرے گا
اندھوں کو خزانے کا نگہبان کرے گا

زد میں اگر آجائے گا حاکم کا قبیلہ
قانون میں ترمیم کا اعلان کرے گا

کب ہوگا سُبک لہروں سے چٹانوں میں رستہ
یہ کام تو بپھرا ہوا طوفان کرے گا

دیوانوں کی تنہائی پسندی کا یہ جذبہ
شہروں کو کسی روز بیابان کرے گا

تھک ہار کے جب رات کو گھر لوٹوں گا اظہؔر
اِک سایہ ستائے گا پریشان کرے گا





چہرے ہر اِک نقاب سے جب پاک ہوگئے
اظہر تمام آئینے سفاک ہوگئے

ننھی سی لَو کے سر کو اٹھانے کی دیر تھی
ہلکی ہوا کے جھونکے غضبناک ہوگئے

اندر کی آگ سب کو کہاں راس آتی ہے
کچھ لوگ کیمیاء نہ ہوئے خاک ہوگئے

خوشبو کو پھیلنے کی ہوس حد سے جب بڑھی
تو شاخ شاخ کلیوں کے تن چاک ہوگئے

شاخوں سے منسلک تھے تو جانِ بہار تھے
شاخوں سے منحرف ہوئے خاشاک ہوگئے

○

بکھری جو ٹکڑے ہو کے مری ذات ہر طرف
آئے نظر انوکھے طلسمات ہر طرف!

عالم پناہ کے نئے منشور کے طفیل !
منڈلا رہے ہیں جنگ کے خطرات ہر طرف

قانون کے لباس میں دربارِ عدل سے
بھیجی گئی ہے زخموں کی سوغات ہر طرف

خوشبو کو قید کرنے کی سازش غلیظ ہے
موجِ صبا نے لکھّی ہے یہ بات ہر طرف

ربِّ عظیم ! میرے چراغوں کی لاج رکھ!
قبضہ جما رہی ہے سیہ رات ہر طرف

پہلی سی وہ سکون کی سانسیں کہاں گئیں ؟
آندھی اٹھا رہی ہے سوالات ہرطرف!





اِک سر، بلند کیا ہوا شہرِ یزید میں
نکلی چمکتے نیزوں کی بارات ہر طرف

انجام دیکھو ''غلبۂ رہزن پرست'' کا
نفرت، عذاب ، آگ کی برسات ہر طرف !

○

رسوا ہوئے ، ذلیل ہوئے ، کوبہ کو ہوئے
جِس لمحہ ''سگ وطیرہ'' ہمارے عدو ہوئے

شمشیر کھینچ کر کہا ظلِّ الٰہی نے !
دیکھیں زمیں کے زخم کہاں تک رفو ہوئے

سوچو! کہ سرحدوں کے تقاضوں سے کیا ملا ؟
دریا تھے ہم سمٹ کے مگر آبجو ہوئے

اِک قطرہ اوس کے لئے پھرتے ہیں شہر شہر
ہائے وہ لوگ جن پہ سمندر سبو ہوئے

پہلے ہوائے شام نے لکھا تمہارا نام
پھر اس کے بعد سارے مناظر لہو ہوئے

بیساکھیوں کا جادو بھی کتنا عجیب ہے
اظہرؔ! تمام بونے یہاں سرخرو ہوئے





○

احساس کا وہ بوجھ ہے ننھی سی جان پر
ہوجائے ریزہ ریزہ جو رکھ دوں چٹان پر

الفاظ گم دعاؤں کے اور ذہن منتشر!
اپنا لہو اچھالئے اب آسمان پر!

اِک چھت کے نیچے رہ کے بھی اِک دوسرے کا خوف
آسیب کا ہے سایہ مرے خاندان پر

ننگی حقیقتوں کا جزیرہ دکھاؤں گا
زحمت نہ ہو تو آیئے میرے مکا ن پر

اظہار کے وہ زاویے ذہنوں کو بخش دے
روحوں کی چیخ کو جو ابھارے زبان پر

اظہرؔ بصیرتوں کے پروں سے اُڑا ہوں میں
حیرت ہے کیوں زمیں کو میری اڑان پر

ضدی سیاہ قلب غضبناک کون ہے
تاریخ سے یہ پوچھ تہہِ خاک کون ہے

شاہانِ بحر! آپ کی دہلیزیں چوم کر
موجیں سوال کرتی ہیں تیراک کون ہے

انساں کے حق میں اہلِ سیاست یا مفلسی
کچھ فیصلہ تو ہو کہ خطرناک کون ہے؟

دانشوروں کی ساری دلیلوں کو کرکے رد
کاغذ کہے گا صاحبِ ادراک کون ہے

نادیدہ انگلیوں سے جو آہستگی کے ساتھ
کرتا ہے چاک کلیوں کی پوشاک! کون ہے





جلتے مکان ، دارورسن ، رات اور میں !
ڈستی ہوئی فضائے وطن ، رات اور میں

رگ رگ میں خواہشوں کا دہکتا ہوا الاؤ
آنکھوں میں اک سلونا بدن، رات اور میں

گاؤں سے آکے کیا ملا رنگین شہر میں
فٹ پاتھ، کنکروں کی چبھن، رات اور میں

اِک موجِ اضطراب میں ڈوبے ہوئے ہیں سب
جگنو ، ستارے، چاند ، گگن ، رات اور میں

سارے بدن پہ سرد خموشی کا پیرہن
آنکھوں میں چیختی سی جلن، رات اور میں

اظہر سیاہ چبھتے سوالوں کے درمیاں
احساس کی لرزتی کرن ، رات اور میں

نہ آہٹوں کا تسلسل نہ کچھ صدا مجھ میں
عجب سکوت کا صحرا اتر گیا مجھ میں

بلاسبب نہیں برگشتگی ہواؤں کی!
چھپا ہوا ہے اثاثہ بہار کا مجھ میں

سلگتے دشت میں تازہ گلاب کی صورت
کِسی کے لمس کا لمحہ کھِلا رہا مجھ میں

زمیں کے چاند دریچہ ترا مقام نہیں
قیام کر میری آنکھوں میں جگمگا مجھ میں

خدایا ریشمی لمحوں کے بیچ رکھنا اسے
جلاتا ہے جو سرِ شام اک دیا مجھ میں





اس نے لکھا تھا رہتے ہیں حاتم نسب یہاں
شانوں سے کاٹے جاتے ہیں دستِ طلب یہاں

بارود کے دھماکوں سے آنکھیں ابل پڑیں !
ایسے منایا جاتا ہے جشنِ طرب یہاں

سورج کو مٹھیوں میں چھپانے کی آرزو !
سودا سما گیا ہے سَروں میں عجب یہاں

کیوں رُک گئے ہو، ناپو میاں اپنا راستہ
نیزے سدا چمکتے رہے بے سبب یہاں

کھو جائے گا نشان تک آغوشِ خاک میں
عکسِ تہہِ وجود ابھارے گا جب یہاں

تبدیل کرزمین کو دریائے نیل میں
فرعونیت کے نشے میں ڈوبے ہیں سب یہاں

جس کو تلاش رہتی تھی ہر پل سکون کی
کرنے لگا ہے اِن دنوں باتیں جنون کی

ہاتھوں میں لے کے ایک بکھرتا ہوا گلاب
تشریح کررہا ہے کوئی اندرون کی !

ہوگا عمل سلگنے کا اب اور تیز تر
لرزا دیا ہے دل کو ہواؤں نے جون کی

ادراک اس کا رکھتی ہیں بجھتی ہوئی رگیں
کتنی عظیم ہوتی ہے اِک بوند خون کی

اظہرؔ! اکھڑتی جاہی رہی ہے زمیں کی سانس
اور جنگ ہے خلاؤں میں علم و فنون کی





ثابت وجودِ اہلِ ستم کرگیا کوئی
اونچا لہو میں ڈوبا علَم کر گیا کوئی

مَیں نے لکھا تھا رات سے لڑنا ثواب ہے
شانوں سے میرے ہاتھ قلم کرگیا کوئی

کچّی کلی پسند ہے عزّت مآب کو
دیواروں پہ یہ بات رقم کرگیا کوئی

شاید کہ ان میں جاگ اٹھی تھی کوئی کرن
کچھ آئینوں کو شہر سے کم کرگیا کوئی

رکھ کے مرے بدن میں اداسی کی ایک موج
چپکے سے میری آنکھوں کو نم کرگیا کوئی

خزانہ آنکھوں کا ایسے کہیں لٹا ہی نہیں
کوئی بھی شخص یہاں خواب دیکھتا ہی نہیں

مِرا قبیلہ سپاہی نہیں مجاہد ہے
کِسی بھی حال میں تلوار بیچتا ہی نہیں

پڑی ہے فکر خلاؤں میں رنگ بھرنے کی
زمیں کا قرض ابھی تک ادا ہوا ہی نہیں

مِرے وجود نے خوش فہمی خاک کر ڈالی !
وہ مطمئن تھے کہ بستی میں آئینہ ہی نہیں

جو جانتا تھا شجرِ سایہ دار کی عظمت!
تو ننھے پودوں کو پیروں سے روندتا ہی نہیں

یہ نسل پہلے ہی پہچان کھو کے بیٹھی تھی
اور اب لبوں پہ کسی کے کوئی صدا ہی نہیں

ہَوا کے زور سے آنکھیں مِلائیں ، جنگ کریں
نئے پرندوں میں اظہرؔ یہ حوصلہ ہی نہیں





خلائیں میں چاند ستارے بکھیر کر صاحب
ہمیں دیئے گئے کمزور بال وپَر صاحب

لِکھا تھا میں نے بِکھرتے تے گلاب کا نوحہ
ہوائیں پوچھتی پھرتی ہیں میرا گھر صاحب

تمام اشک دیئے خون تک نچوڑ دیا
مگر نہ سبز ہوا بیسواں شجر صاحب

سلگتی ریت سفر میں ہے ساتھ ساتھ مرے
ہے جب سے ہونٹوں پہ اِک حرفِ معتبر صاحب

کہاں اجالے کہ دستک دروں پہ دیتی ہے
سیاہ شال میں لپٹی ہوئی سحر صاحب

تمنا تھی کہ بدن کے پڑاؤ سے نکلوں
ہوں اب تو خوش کہ ملا مژدۂ سفر صاحب

○

منتظر ہے برسوں سے میرے گھر کا سنّاٹا
کوئی توڑ دے آکر بام و در کا سنّاٹا

ہاتھ تیری یادوں کے رکھ گئے ہیں بستر پر
کانٹے رت جگوں کے اور رات بھر کا سنّاٹا

زندگی کی ہلچل میں ڈوبی شاہراہوں پر
ناچتا ہے صحرا کی دوپہر کا سنّاٹا

جانے کتنے جذبوں کی چیخ دفن ہے اس میں
بند مقبروں جیسا چشمِ تَر کا سنّاٹا !!

جِسم سارا جلتا ہے دیکھتا ہوں جب اظہرؔ!
چاندنی کی بانہوں میں بحر و بر کا سنّاٹا





○

سخت لمحات دے، بپھرے طوفان دے
تنکوں کوان کی، ہستی کا عرفان دے

خاک اور خوں میں ڈوبی زمیں کو سنوار
خشک پیڑوں کو اب سبز رت دان دے

وادیٔ سنگ سے تارگِ برگِ گل
چیختے نقش خوشبو کا وردان دے

منجمد شب میں سورج اُبھر آنے کا
ٹمٹماتے دیئے جیسا اِمکان دے

تتلیاں زرد بچوں کے ہاتھوں پہ رکھ
ان کے معصوم ہونٹوں کومسکان دے

کیا کروں گا فرشتوں کی بستی میں مَیں
میرے اطراف مجھ جیسے انسان دے

○

کچھ سَرفروش اس طرح میداں میں ڈٹ گئے
عالم پناہ ! جنگ کی بازی اُلٹ گئے

مَیں تھامنے ہی والا تھا گرتا ہوا عَلم
پیچھے سے ایسا وار ہوا ، ہاتھ کٹ گئے

صحراؤں کو غذائی ضرورت نگل گئی
شہروں کی زد میں آکے سمندر سمٹ گئے

تھا حادثہ عجیب کہ میرے مکان سے
دیوانہ وار آگ کے شعلے لپٹ گئے

پھر ان بکھرنے والوں کی مٹی سے ایک دن
ایسا غبار اٹھا کے آئینے اَٹ گئے





○

کیا دے گی تجھ کو جرأتِ اظہار دیکھنا
چومے گی جسم تیروں کی بوچھار دیکھنا

آنکھیں کھلی رکھو کہ میاں ہر طرف یہاں
کاجل چرانے والے ہیں عیّار دیکھنا

کچھ کی ہے ننھے بچوں نے گلکاریٔ خیال
یارو! ہمارے شہر کی دیوار دیکھنا

روتا ہے دیکھ دیکھ کے تازہ گلاب کو
لاحق ہوا اسے عجب آزار دیکھنا

دستِ صبا سے خوشبو کا رشتہ نہیں رہا
تقدیر میں ہے کیا کیا مِرے یار دیکھنا

جب پھوٹ جائیں گے مِرے پیروں کے آبلے
صحرا میں پھر ہرے بھرے اشجار دیکھنا

جاناں ! جوان رکھتا ہے شوریدگی کی رَو
خوابوں میں تیرے گیسوئے خمدار دیکھنا

رَن سے بلاوا آتے ہی اِک خواب سا لگا
آٹھوں پہر ترے لب و رخسار دیکھنا

جب کائنات سوتی ہو اظہرؔ سکون سے
ہم دِل جلوں کو ایسے میں بیدار دیکھنا





○

لہو کے پھول کہیں بھی نظر نہیں آتے
لگے ہے اَب یہاں آشفتہ سر نہیں آتے

ہزاروں آنکھیں بجھاؤ ، مگر یہ یاد رہے
گرفتِ جبر میں خوابِ سحر نہیں آتے

تمام راستے صحراؤں کے مُقلّد ہیں
کِسی بھی راہ سے جاؤ شجر نہیں آتے

جو تیز و تند ہواؤں کی صَف کو چیر سکیں
سبھی کے حصے میں وہ بال و پر نہیں آتے

ہمارا عَہد بھی بپھرا ہوا سمندر ہے
کِنارے گم ہیں جزیرے نظر نہیں آتے

کچھ ایسی بے خودی اظہرؔ شفق جگاتی ہے
کہ اپنے آپ میں ہم رات بھر نہیں آتے

○

اِک ہمہ گیری کا حامِل قطرۂ آزاد بھی !
آبروئے بحر بھی ہے بحر کی بنیاد بھی

آگے آگے چل رہا ہے خوبصورت گھر کا خواب
پیچھے پیچھے ہے مرے طوفانِ برق و باد بھی

ڈوبتی آوازوں کی صف سے ذرا ہی دور پر
شاہِ عالم! گونجتی ہے اِک نئی فریاد بھی

ہوگئی ویران باہر کی ہَوا کے زہر سے
ورنہ یہ بستی تھی صاحب کل تلک آباد بھی

بدلا بدلا ہے مزاجِ اہل قریہ اِن دنوں
اب اثر کرتے نہیں ہیں آپ کے ارشاد بھی

شوق سے کاٹو سَروں کی فصل لیکن سوچ لو
کہ ہوا کرتی ہے ہر موسم کی ایک میعاد بھی





○

دھوپ کی شدت بنی کالی گھٹا میرے لئے
ہاتھ اٹھا کر اس نے جب مانگی دُعا میرے لئے

یادوں کی پرچھائیوں کے ساتھ لیکر آئے گی
اس کی زلفوں کی مہک موجِ صبا میرے لئے

مَیں کہ مہرِ نیم شب مجھ کو بُجھانا ہے محال
سازشیں کر یا کہ دیواریں اٹھا میرے لئے

چین سے سو جاؤں گا جب میں دکھوں کی گود میں
سر پٹک کر روئے گی وحشی ہوا میرے لئے

مسئلوں کی فوج کے ہمراہ اس کے شہر میں
منتظر تھی اِک طِلسماتی فضا میرے لئے

خواہش کہاں کہ خواب نیا دیجیۓ مجھے
آنکھیں بجھا سکوں یہ دعا دیجیۓ مجھے

کب تک گرفتِ موجۂ صرصر کا سلسلہ
اب تو سراغِ شہرِ صبا دیجیۓ مجھے

رہ رہ کے چیخ اٹھتی ہے لاشوں تلے زمیں
عالم پناہ! سبز قبا دیجیۓ مجھے

اب تو گلی گلی یہاں میدانِ جنگ ہے
تلوار کھینچنے کی ادا دیجیۓ مجھے

تاریخ ہوں نوشتۂ دیوارِ وقت ہوں
طاقت ہو آپ میں تو مٹا دیجیۓ مجھے

مَیں بانٹتا ہوں سانسوں کی تہذیب کا شعور
’’کالے سمندروں کی سزا دیجیۓ مجھے‘‘





کشتیاں پھونکنا دریا کے سفر میں رہنا
اِس قبیلے کی تو فطرت ہے بھنور میں رہنا

سایۂ دارورسن آٹھوں پہر رہتا ہے
کھیل سمجھے ہو صفِ اہلِ نظر میں رہنا

جب کڑی دھوپ دماغوں میں اتر آئی ہو!
راس کیا آئے گا آغوشِ شجر میں رہنا

خواب سے آگے کی منزل ہوں مجھے خود میں سمیٹ
مجھ کو منظور نہیں دیدۂ تر میں رہنا

کھا گئی رشتوں کی پہچان غلافوں کی وبا
اجنبی کی طرح اب اپنے ہی گھر میں رہنا

آزمائش کا ہے لمحہ کہ چراغوں کے لئے
حکم آیا ہے ہواؤں کے اثر میں رہنا

منسلک رکھتا ہے تہذیب و ہنر سے مجھ کو
ایک مرے چہرے کا دیدۂ تر میں رہنا

چاندنی ، پھول، شفق ،تتلی ، ستارے، جگنو
چاہتے سب ہیں مرے نقشِ ہنر میں رہنا

کہہ دیا ہوگا صبا سے تری زلفوں نے کبھی !
انگلیاں تھام کے خوشبو کی سفر میں رہنا

مضطرب رکھتا ہے سورج کو ، ہَوا کو اظہر!
ایک پتے کا ابھی شاخِ شجر میں رہنا





○

مجھ کو تنہائی کا یہ دشتِ بلا دیتے ہوئے
آنسو آنسو ہوگیا کوئی دعا دیتے ہوئے

سبز پرچم جس قبیلے کا ہے اس کو دیکھنا
اس زمیں کو سبز موسم کی قبا دیتے ہوئے

کِس میں کتنا زور ہے یہ فیصلہ ہو جائے گا
دشمنو! آؤ مقابل میں صدا دیتے ہوئے

راکھ ہو جاتے ہیں جانے کتنے ہی معصوم خواب
سوچتا ہے کون شعلوں کو ہَوا دیتے ہوئے

صبح تک اس کی حفاظت کی بہت تلقین کی
دستِ شب میں شام نے بجھتا دیا دیتے ہوئے

○

راہِ ہوس کو اور بھی ہموار مت کرو!
نادانو! شاہزادے کو بیدار مت کرو

یہ کہہ رہے ہیں دھوپ کے سفاک زاویے
اب اعتبارِ سایۂ اشجار مت کرو

اک حملہ فتحیاب کرے گا ہمیں مگر
میر سپہ کا حکم ہے یلغار مت کرو

شب زادو! آؤ سامنے روشن چراغ کے
چھپ کر منافقوں کی طرح وار مت کرو

درّانہ شور کرتی ہوئی آئیں آندھیاں
اس طرح اپنے آپ سے انکار مت کرو

پہلے ہی سے ہے زندگی جیسے کوئی سزا
اب سانس لینا اور بھی دشوار مت کرو !





○

تتلی ، ستارے ، پھول ، لطافت خریدیئے
اپنا ضمیر بیچئے ، جنّت خریدیئے

نیزے ، صلیب ، آگ کی چادر ، لہو کی موج
سچ بولئے تمام اذیت خریدیئے

پھر کس کے پیر چومے گی صحرا کی تپتی ریت
دیواروودر ہمارے لئے مت خریدیئے

کس نے کہا غلافوں سے یوں رشتہ جوڑ کر
چہرے سے آئینوں کی بغاوت خریدیئے

دریا کی تہہ پکارے گی سارے وجود کو
ہرگز نہ اجلی پریوں کی الفت خریدیئے

اس شوخ کی گلی میں کسی نے یہ لکھ دیا !
ہوش و خرد گنوایئے وحشت خریدیئے

پہلے خود اپنی آنکھوں میں کانٹے چبھوئیے
تب میرؔ اور فراقؔ سی عظمت خریدیئے





○

ہے ذرّہ ذرّہ کتنا چمکدار دیکھنا
اظہرؔ رہِ حریفِ شبِ تار دیکھنا

اس مردِ حق شناس کی کوشش سے بن گئے
بِدعت کے صحرا دین کے گلزار دیکھنا

آیا تھا سنگ ریزوں کی بستی سنوارنے
اس نے تراشے گوہرِ شہوار دیکھنا

مَیں خیر کم نظر ہوں مری اشکباری کیا
دیدہ وروں کے دیدۂ خونبار دیکھنا

نیندوں کو قتل کر کے جلاتا رہا دماغ
مقصد تھا اس کا قوم کو بیدار دیکھنا

ہے کون سایہ بخش یہاں اس شجر کے بعد
سر پہ سلگتی دھوپ کی بوچھار دیکھنا

○

اپنی نیت ، اپنے مسلک کو عیاں اس نے کیا
امن کی بستی کو شہرِ خونفشاں اس نے کیا

اپنی ضد، اپنی خباثت کی بلندی کے لئے
ننھے ننھے بچوں کو بے سائباں اس نے کیا

سوئے ایراں دیکھ کر کہتی ہے روحِ ابرہہ
مرحبا! میری روایت کو جواں اس نے کیا

اتری جب اس کے عمامے کی سیاہی دل تلک
پانیوں کو موت کا کالا دھواں اس نے کیا

جانبِ ارضِ مقدس جامۂ احرام کے
کیسی کیسی وحشتوں کو ہم عناں اس نے کیا

اپنی کالی ذہنیت کی پردہ پوشی کے لئے
بے ردا اظہرؔ سر دوشیزگاں اس نے کیا





○

دہلیزِ مصلحت پہ یہ سر خم نہ کیجئے
مِٹ جائیے اَنا کو مگر کم نہ کیجئے

پہچانتا ہے کون سلیقوں کی نرمیاں
برباد اپنی ذات کا ریشم نہ کیجئے

ہے شورشوں سے بچنے کا آسان راستہ
اپنے مفاد کو کبھی پرچم نہ کیجئے

کچھ واقعات کیلئے رکھیئے سنبھال کر
ہر حادثے پہ آنکھوں کو یوں نم نہ کیجئے

ساری زمیں ہے آپ کی اٹھ کر سمیٹئے !
ٹکڑا جو کھو گیا تو کچھ غم نہ کیجئے

نغمہ، گلاب، تتلی، ستارہ، صبا ہے وہ
یا برگِ گل پہ لکھی ہوئی اک دعا ہے وہ

یہ کائنات میرے لئے کالی رہگذر
اور رہگذر میں جلتاہوا اک دیا ہے وہ

اس کے خیال سے ہے مری شاخِ جاں میں نم
آنکھوں میں روشنی کی طرح بس گیا ہے وہ

میں عکسِ آرزوئے شبِ ہجر ہوں یہاں
کاغذ پہ لفظ لفظ جسے لکھ رہا ہے وہ

میرا وجود ہے کسی ویراں مکان سا
اور اس میں پھول لمحوں کا اک قافلہ ہے وہ

رہتا ہے ساتھ ساتھ بچھڑنے کے بعد بھی
اظہؔر رفاقتوں کا عجب سلسلہ ہے وہ





بے چین روح ،جسم کے اندر ہے آب آب
کوزے میں بند گویا سمندر ہے آب آب

بدلی ہے رت تو دیکھنے والے نہیں رہے
ایسی بہار ہے کہ گلِ تر ہے آب آب

آئینہ توڑنے کو اُچھالا گیا مگر
خود اپنا عکس دیکھ کے پتھر ہے آب آب

سب پڑھ رہے ہیں اپنی بصیرت کا مرثیہ
اندھوں میں کرب ذات کا منظر ہے آب آب

تعبیر کی صلیب سے ابھرے ہیں یوں سوال
جیسے ہر ایک خواب پگھل کر ہے آب آب

ہم محوِ خواب برف کے جس مقبرے میں ہیں
اظہؔر اسی پہ دھوپ کا لشکر ہے آب آب

چند آنسو خونِ دل حرفِ دعا لے جائیگی
صاحبو! یہ رات ہم سے اور کیا لے جائیگی

رکھ کے ٹھنڈے خون میں آتشکدہ یہ چاندنی
قطرہ قطرہ نیند آنکھوں سے اٹھالے جائیگی

جاتے جاتے رات اک محتاط لڑکی طرح
سب ستارے اپنے آنچل میں چھپالے جائیگی

قتل کردوگے مجھے تو فتح کی صورت میں پھر
دشمنوں کی فوج میرا ''خوں بہا'' لے جائیگی

کس کو تھا معلوم ننگے قائدوں کی رہبری
چھین کر تلواریں ہم کو کربلا لے جائیگی

کس طرح دیکھوگے اظہرؔ اپنے چہرے کے نقوش
عکس دشمن یہ ہَوا جب آئینہ لے جائیگی





ہوں کوئی پت جھڑ کے پیڑ جیسا بہار دینا
اے'' موسمِ ہفت رنگ'' مجھ کو سنوار دینا

دھنک بدن کی لبوں کی سرخی جبیں کی شبنم
میں کورا کاغذ ہوں کچھ تو نقش و نگار دینا

حصارِ تیرہ شبی میں دل بستگی کی خاطر
سیہ فضاؤں کو جگنوؤں کی قطار دینا

کسی بھی صورت یہ کالی راتیں گذارلیں گے
ہے شرط لیکن سحر ہمیں شاندار دینا

اب اور کب تک تمازتوں کے عذاب جھیلوں
جو ہوسکے تو شجر کوئی سایہ دار دینا

تری طرف میں اُڑوں گا نازک پروں سے اپنے
مگر حدِ لامکاں سے مجھ کو پکار دینا

نہیں ہے مشکل ہمارے دستِ ہنر کے آگے
سیہ چٹانوں پہ عکس کوئی ابھار دینا

ہے ٹوٹنے کو الجھتی سانسوں کی ڈور اظہرؔ
نقاب چہرے پہ جتنے ہیں سب اُتار دینا





○

اداس شام کے سائے میں بیٹھ کر لکھنا
بچھڑنے والی کچھ احوالِ چشمِ تر لکھنا

ہمارے شہر کا موسم ترے لبوں جیسا !!
تو اپنے شہر کے موسم کا کچھ اثر لکھنا

یہ رات ہجر کی سادہ ورق کے جیسی ہے
تو آنسوؤں سے مرا نام رات بھر لکھنا

عجب جنوں ہے کہ تیرے صبیح چہرے کو
کبھی بہار کبھی جنّت نظر لکھنا

گلاب چہرہ سمندر بدن سی اک لڑکی
سِکھا گئی ہے مجھے رات بھر بھنور لکھنا

تمام آنکھوں پہ عینک سجی ہوئی ہے یہاں
جواز رکھنا کسی کو جو دیدہ ور لکھنا

ہمارے عہد میں زندہ مزار چلتے ہیں
ہر اک وجود کی تہہ میں یہ ڈوب کر لکھنا

نئے عذاب تعاقب میں ہوں گے ہرلمحہ
پیمبری ہے میاں حرفِ معتبر لکھنا

ہزاروں مسئلے جیتے ہیں میری چھاؤں میں
اے عہدِ نو کے مورّخ مجھے شجر لکھنا





○

منجمد ماحول بے صوت و صَدا چاروں طرف
رقص میں پر ہول سنّاٹا مِلا چارو ں طرف

باغبانِ لَم یزِل خوشبو کے دے اذنِ سفر
جستجو کرتی ہے آوارہ صبا چاروں طرف

اس صدی کا لمحہ لمحہ صاحبو برزخ بکف
آگ کے شعلوں سے ہے لِکھا ہوا چاروں طرف

ساری قدریں آبدیدہ سب صحیفے دَم بخود
سایۂ تشکیک ہے پھیلا ہوا چاروں طرف

اتنی سمتیں تھیں کہ منزل تک پہنچ پائے نہ ہم
زاویہ در زاویہ الجھاؤ تھا چاروں طرف

کِس طرح دیکھوں میں اظہؔر داغِ رخسارِ وجود؟
آئینے کردار کے ہیں بے ضیا چاروں طرف

اجالوں کی کبھی اس طرح سے یلغار ہوجائے
تسلسل رات کا خود ہی سحر آثار ہوجائے

اگر اپنی بصیرت کی شعاعیں لفظ میں رکھ دوں
تو چشمِ لفظ سے جاری لہو کی دھار ہوجائے

ہے محرومی کے شعلوں کا ہدف اک اک نفس میرا
خوشی کے خواب دیکھوں زندگی آزار ہوجائے

مسرّت کے پیمبر نے مجھے اتنی دعا دی ہے
اذیّت کے دہکتے دشت سے تو پار ہوجائے

مَیں مفروضے بسالوں اپنی سانسوں میں اگر اظہؔر
حقائق کی صدی کا یہ سفر دشوار ہوجائے





خبطِ دماغ پر ہے جدّت کا مرثیہ
انگشتِ موم اور تمازت کا مرثیہ

مایوسیوں کی دھوپ ہے صحرائے ذات میں
لکھیئے سنہرے خوابوں کی لذت کا مرثیہ

قدروں کے اتصال کا تحفہ ہے اور کیا
تہذیب و فکر فن کا بصیرت کا مرثیہ

اپنی صدی کی شرح میں لکھنا پڑا مجھے
کردار اور خلوص کی عظمت کا مرثیہ

کترا رہے ہیں لوگ اب اپنے ہی عکس سے
ہر آئینہ ہو جیسے شباہت کا مرثیہ

اظہؔر وہ کیسے لوگ ہیں جن کا نصیب ہے
اِک سروِ پا بہ گل کی محبت کا مرثیہ

ہزار طرح کے خود پر عذاب دیکھوں گا
مَیں جب کبھی کوئی تازہ گلاب دیکھوں گا

ابھی دماغ سلامت ہے میرا ہمسفرو!
میں تپتے صحرا میں دریا کا خواب دیکھوں گا

میں اتنا عام کروں گا ہنر چراغوں کا
کہ ذرّے ذرّے میں اِک آفتاب دیکھوں گا

کہیں مکان دے، ٹکڑا دے سبز موسم کا
میں اپنے پیروں میں کب تک رکاب دیکھوں گا

میں گھر پہنچتے ہی دو جھیل جیسی آنکھوں میں
چراغ ، پھول ، شفق ،ماہتاب دیکھوں گا





فن کے موتی فِکر کے گلہائے تر دیکھے گا کون؟
پتھروں کے شہر میں لعل و گہر دیکھے گا کون؟

کر گیا معتوب احساسِ صلیب شعلگی!
جلتے دل، جلتی نگاہیں ، جلتے گھر دیکھے گا کون؟

سبز رت کی صبح ملبوسِ تمازت ہو اگر
زرد موسم کی سلگتی دوپہر دیکھے گا کون؟

قید ہیں اپنی حدوں میں سب لکیریں کھینچ کر
فاصلوں کی دھوپ میں جلتے شجر دیکھے گا کون؟

''کرب'' بینائی کا مَیں الفاظ میں رکھ دوں مگر
شیشۂ الفاظ میں عکسِ نظر دیکھے گا کون؟

جل رہا ہے ذات کے برزخ میں احساسِ یقیں
"اب کے رُت بدلی تو خوشبو کا سفر دیکھے گا کون؟"

تھا درِ ادراک پر تحریر اظہر یہ سوال !
زرد خوابوں میں پلی تتلی کے پَر دیکھے گا کون؟





○

جس وقت عالی جاہ کے تیور بگڑ گئے
دو چار کوڑے پشت پہ سب کی ہی پڑ گئے

شاید کہ آندھیوں میں سیاسی شعور تھا
سب سایہ دار پیڑ جڑوں سے اکھڑ گئے

تھے ساتھ ساتھ مرحلۂ لب کشائی تک
پھر سارے ہمسفر مرے مجھ سے بچھڑ گئے

آنکھوں میں آسمان لئے چل رہے تھے سب
اِک موڑ ایسا آیا کہ ٹکرا کے لڑ گئے !

اندر سے ریگ زار کیا کِس طلسم نے
آنکھوں کے چاند بجھ گئے اور دل اجڑ گئے

پہنچی ہے اس مقام پہ آسائشوں کی چاہ
اظہر ہوس کے نیزے دماغوں میں گڑ گئے

آئے گا ایسا وقت بھی عالم پناہ پر
حجرے میں چھپ کے روئیں گے تخت و سپاہ پر

انصاف کی طلب یہاں جرمِ عظیم ہے
آویزاں کر دو لکھ کے ہر اِک عدل گاہ پر

نکلی محل سے ملکۂ عالم کی موت اور
پہرے لگائے جاتے رہے شاہراہ پر

مَیں سانس لے رہا ہوں یہ کیسے دیار میں
سب لوگ ناز کرتے ہیں اپنے گناہ پر

ساری زمین بیچ کے انسان آج کا !!
نظریں لگائے بیٹھا ہے اب مہر و ماہ پر





سرحدوں پر سکوت طاری ہے
اور مکانوں میں جنگ جاری ہے

چیخ کو رو رہے ہیں سنّاٹے
ابکے ظالم کی وارکاری ہے!!

شہر سے رونقوں نے ہجرت کی
اب بگولوں کی شہر یاری ہے

کیا کہا ابر نے سمندر سے
موج در موج بے قراری ہے

اے گھنے پیڑ مَیں کہاں تجھ سا
سبز موسم سے تیری یاری ہے

کاش! کاغذ پہ منتقل ہوتی
میرے اندر جو جلوہ باری ہے

جھونکے نئی رتوں کے عجب کام کر گئے
سارے گلاب خشک ہوئے رنگ مر گئے

اڑتی ہے دُھول آنکھوں کے ویران دشت میں
سب جگمگاتے خواب نہ جانے کدھر گئے

مَیں چپ تھا اور ذہن کی سنسان راہ سے
پرچھائیوں کے چیختے لشکر گذر گئے

پھر درد سانس لینے لگا موج کی طرح
مَیں تو سمجھ رہا تھا کہ سب زخم بھر گئے

مالک ہیں اس کے ہم یہ ہماری زمین ہے
اِس ایک بات پر یہاں کتنوں کے سَر گئے

ہم بوریہ نشینوں کی گردن نہ جھک سکی!
حربے رئیسِ شہر کے سب بے اثر گئے





مَیں رت جگوں کو جھیل کے جب مہؔر بن گیا
تِنکا تھا چشمِ وقت مَیں شہتیر بن گیا

جب مَیں میں گم تھا کچھ نہ تھا میری گرفت میں
ٹوٹا حصارِ ذات ہمہ گیر بن گیا

دستِ سکوں خلاؑ سے بلاتا رہا مگر ۔۔!
اِک چہرہ میرے پاؤں کی زنجیر بن گیا

حالات لے کے آ گئے یہ کیسے موڑ پر؟
جھونکا صبا کا جلتا ہوا تیر بن گیا

گُل بوٹوں سے وہ کھردرے کاغذ سنوار کر
فن اور لہو کے رشتے کی تفسیر بن گیا

اِس درجہ خوف کھاتا ہے سورج سے کیوں وجود
کیا برف پر لکھی ہوئی تحریر بن گیا

مہنگا پڑا لہو کے تقاضوں سے انحراف
اظہرؔ لہو اُگلنا ہی تقدیر بن گیا





○

خوابوں کی تتلیوں سے اگر دل لگاؤ گے
تنہائیوں میں رات کی آنسو بہاؤ گے

اِک دھند چاٹ جائے گی چہرے کے سب نقوش
آئینہ توڑنے کی سزا یوں بھی پاؤ گے

بارود، موت، ریت کی چادر، دھوئیں کے پھول
اِس طرح سے زمین کو کب تک سجاؤ گے

کب توڑتی ہیں روح کے رشتے جدائیاں
ہر لمحہ آنسوؤں میں مرے جگمگاؤ گے

جب دل میں پھوٹ نکلیں گی یادوں کی کونپلیں
آنچل میں اپنے اس گھڑی آنسو چھُپاؤ گے

مجبور کتنا ہوتا ہے ہر اِک عظیم شخص
یہ راز جب عظیم بنوگے تو پاؤگے!

کردوگے کائنات کو زیر و زبر سلاؔم
اظہؔر کی بددماغی سے تم ہارجاؤگے





اپنے لہو کی آگ میں جلتی ہے یہ صدی
شعلے قدم قدم پہ اگلتی ہے یہ صدی

باہر سے خوشنما مگر اندر سے کھوکھلی
گہوارۂ تضاد میں پلتی ہے یہ صدی

برگ و شجر کے حسن کو ترسے گی کل ہر آنکھ
شادابیاں زمیں کی نگلتی ہے یہ صدی

حیراں ہیں آئینے کہ نہیں عکس مستقل
ہر لمحہ اپنا چہرہ بدلتی ہے یہ صدی

دیتی ہے پہلے جنگ کے شعلوں کو خود ہَوا
اظہؔر پھر اپنے ہاتھوں کو ملتی ہے یہ صدی

○

خوشبو شعاع کیف سَراپا امنگ تھی
ساعت تمہارے قرب کی صد موجِ رنگ تھی

موقع ملا تو اپنے ہی چہرے سے ڈر لگا
آئینہ دیکھنے کی ہمیں کب امنگ تھی

پاتی مہکتے خوابوں کی دہلیز کس طرح
وہ نسل جس کو خود ہی سے درپیش جنگ تھی

اپنے لہو کی آگ میں جھلسا تھا ہر بدن
حیراں تھے عقل وہوش بصیرت بھی دنگ تھی

اظہرؔ تھی جس کی ڈور ہواؤں کے ہاتھ میں
میری حیات ایسی بھٹکتی پتنگ تھی !





○

رگ رگ میں اک کھنچاؤ تھا، حالت عجیب تھی
پچھلے پہر جو ٹوٹی قیامت عجیب تھی

دہکا گئی وجود میں پھر خواہشوں کی آگ
پوشیدہ چاندنی میں تمازت عجیب تھی

پتھر میں بھی لگاتے تھے لہروں کا ہم سراغ
بخشی گئی جو ہم کو بصیرت عجیب تھی

انصاف بہہ رہا تھا دلیلوں کی لہر میں
آئین تھا عجیب ، عدالت عجیب تھی

حیراں تھا پیشِ آگہی پیکر قیاس کا
آئینہ سامنے تھا شباہت عجیب تھی

خاموشیو ں کی گرد تھی ہونٹوں پہ تہہ بہ تہہ
آنکھوں میں چیختی ہوئی وحشت عجیب تھی

کیسے کریں بیان کہ الفاظ ہی نہیں
لِکھ دو ہمارے درد کی شدت عجیب تھی

کھوئی ہوئی حیات تھی آغوشِ رنگ میں
اظہرؔ! وہ چند لمحوں کی قربت عجیب تھی





چمکتے خوابوں کی بستی بسانے والی ہے!
ہَوا جو تیرے جھروکے سے آنے والی ہے

بجھائے جاتی ہے اک ایک کر کے سارے دیئے
یہ رات پھر کوئی طوفاں اٹھانے والی ہے

کنارے رہنے دو قانون کی کتابوں کو!
کہ شاہزادی عدالت میں آنے والی ہے

کبھی تو لگتا ہے یہ قوم یوں ہی سوتے ہوئے
تباہی اپنا مقدر بنانے والی ہے

مرے جوانوں کو اظہرؔ خبر نہیں اسکی
سروں پہ ان کے قیامت جو آنے والی ہے

○

سایہ، بارش اور خوشی سے زیست کا رشتہ نہ تھا
جبر کی زد میں تو انساں یوں کبھی آیا نہ تھا

ہم ہَوا کے زور سے لڑنے کو لڑ جاتے مگر
خواب کی شاخوں پہ ظالم ایک بھی پتّہ نہ تھا

تشنگی کے اس دہکتے قطرے کی تجسیم ہوں
کافی سیرابی کو جس کی ایک بھی دریا نہ تھا

زرد ہو پائے نہ جو اپنے ہی زہرِ عکس سے
آئینے کے سامنے ایسا کوئی چہرہ نہ تھا

ساری تاریخیں نفی کرتی گئیں اس اَمر کی
روشنی آزاد تھی اس پر کوئی پہرہ نہ تھا

کیسے دے اظہر وہ خوشبو کے جزیروں کا پتہ
جس کی قسمت میں کوئی مہکا ہوا لمحہ نہ تھا





○

کرب کی دسترس سے نکلے گا
جب اَنا کے قفس سے نکلے گا

اُجڑی بستی میں رنگ و بُو کا جلوس
کیا خبر کس برس سے نکلے گا

جانے کب چاند میری خواہش کا
یاس کی دسترس سے نکلے گا

دل مسرّت کا آئینہ ہوگا
جب حصارِ ہوس سے نکلے گا

راستہ خوشبوؤں کی وادی کا
ذات ہی کے قفس سے نکلے گا

اِنقلابِ نظام برحق ہے !
کِس صدائے جرس سے نکلے گا

رُوح کی آگ مت جگا اظہر!
شعلہ اک اک نفس سے نکلے گا

تیز آندھی میں جلتا دیا ہاتھ پر
رکھ کے نکلا ہوں مَیں معجزہ ہاتھ پر

ہم سے درویشوں کو ہفت اقلیم ہے
یہ ٹپکتا ہوا آبلہ ہاتھ پر!!

رکھ دیئے تھے کبھی اس پہ خوشبو نے لب
عمر بھر اک ستارہ رہا ہاتھ پر

خون میں ڈوب کر دھوپ چنتا رہا
جانے کیسا عجب قرض تھا ہاتھ پر

میری پہچان فتنے نگلتے نہیں
رکھ گیا ہے کوئی آئینہ ہاتھ پر

یہ محافظ ہے اظہرؔ مری آن کا
لمحہ لمحہ ہو فضلِ خدا ہاتھ پر





جو چاندنی میں اکیلی حیات ہوتی ہے
تو ایسی رات قیامت کی رات ہوتی ہے

وہیں پہ ہے مری پہلی اڑان کی منزل
جہاں پہ ختم حدِ کائنات ہوتی ہے

خدایا! سایۂ شمشیر کو گھنا کردے
اسی میں میری نمودِ صفات ہوتی ہے

جیالو! فتح کی مستی میں یہ خیال رہے
کبھی خود اپنے لہو سے بھی مات ہوتی ہے

تمام رنگوں سے ہجرت کے بعد بھی اظہرؔ!
نہ جانے کون سے موسم کی بات ہوتی ہے

ہماری بستی دیارِ سحر گزیدہ ہے
ہر ایک بات پہ سیہ رات کا قصیدہ ہے

ہمارے واسطے کوئی شفیق ہاتھ کہاں
سَروں پہ سایۂ شمشیر آبدیدہ ہے

نہ جانے کس کی نظر کھا گئی جوانوں کو
بجھی بجھی سی ہیں آنکھیں کمر خمیدہ ہے

عزیزِ شہر شہادت ہے سب خلاف مرے
مِرا گواہ مِرا دامنِ دریدہ ہے !!

لہو سے جو نئے نقشے بنانے نکلی ہے
وہ فوج تیرے مظالم کی آفریدہ ہے

ہمارے سچ کی حمایت کرے گا کون اظہرؔ
کہ فرد فرد یہاں کا زباں بُریدہ ہے





لہو لہان ہیں آنکھیں عذاب مت دینا
ہمیں کسی نئے موسم کا خواب مت دینا

مزاج پوچھے گا پھر سارے خشک زخموں کا
ہمارے ہاتھوں میں تازہ گلاب مت دینا

خدایا وہ بڑے حسّاس دل کا مالک ہے
سکون دینا اُسے اضطراب مت دینا

دھنک نے اس کے قدم چوم کر دعا مانگی
کِسی کو ایسے غضب کا شباب مت دینا

کہاں کہاں پہ گذارے ہیں ہجر کے لمحے !
وہ شوخ پوچھے تو کوئی جواب مت دینا

درخت انار کا سایہ فگن ہو اظہرؔ پر
جو یہ نہیں تو شبِ ماہتاب مت دینا

دل کے زخموں کی یوں خوشبو نے مسیحائی کی !
گل گزیدوں نے بگولوں سے شناسائی کی

ہاتھ میں یوں ہی نہیں آئی ہے موجوں کی لگام
ہم نے اک عمر سمندر سے حریفائی کی

خیر آئے ہو تو آنکھوں کو بچائے رکھنا
قیمتیں لگتی ہیں اس شہر میں بینائی کی

چاہے کچھ بھی ہو مگر اڑنا ہَوا کے رخ پر
کچھ پرندوں کے لئے بات ہے رسوائی کی

سَر اُچھلنے کا ، زبا ں کٹنے کا موسم آیا !
سامنے آئے جسے تاب ہو گویائی کی !!





کچھ دعا کے پھول ، اشکوں کے گہر رکھ دیگا وہ
میرے ہاتھوں پر یہی زادِ سفر رکھ دیگا ہو

دھوپ پھر قبضہ کرے گی فاتحانہ شان سے
کاٹ کر بستی کے جب سارے شجر رکھ دیگا وہ

آئینوں سے عکس لیجائے گی اک اندھی بلا
چہرہ چہرہ جب نقابوں کا ہُنر رکھ دیگا وہ

اپنی ہستی کو مٹا کر آنے والوں کے لئے
رات کے کالے جزیرے میں سحر رکھ دیگا وہ

رات دن مانگیں دعائیں جس سپاہی کے لئے
کِس کو تھا معلوم کہ تیغ وسپر رکھ دیگا وہ

اس گھڑی جوشِ ہجوم سنگِ فطرت دیکھنا
جب شجر پہ برگ شاخوں پہ ثمر رکھ دیگا وہ

آپ دیکھ نہ پاؤ گے کھِلتے ہوئے پھولوں کو
یہ نسل چڑھاتی ہے پَروان ببولوں کو

شہزادے نے پہلا ہی فرمان کیا جاری
اب موجِ صبا لکھو آوارہ بگولوں کو !!

سینے ہوئے چھلنی تو، یہ شور، یہ ماتم کیوں
خود تم نے توانائی بخشی ہے ہیولوں کو!

دیوار ہو کوئی بھی شق ہوگی کلی جیسی!!
معیار بنالینا خوشبو کے اصولوں کو !

مٹّی کے بلاوے میں تاثیر ہی ایسی تھی
رُخصت کیا شاخوں نے ہنستے ہوئے پھولوں کو





لُٹ کر بھی قاتلوں کو قصیدے سناؤ گے
نادانو! اپنے آپ کو کتنا گراؤ گے

کچھ فائدہ نہ دے گا تمھیں ''جشنِ مصلحت''
یوں ہی ہمیشہ اپنے لہو میں نہاؤ گے

یہ ناگ کے پجاری ، یہ تفریق کے امین
ان سے سوائے زہر کے کچھ بھی نہ پاؤ گے

عینک سجی ہے اِن کی ہی منصف کی آنکھ پر
اِنصاف لینے کس کی عدالت میں جاؤ گے

گھر تک نہ اپنے آئیں گے اب آگ اور خون
یہ جھوٹے خواب آنکھوں میں کب تک سجاؤ گے

تب ختم ہوگا کالے عذابوں کا سلسلہ
جب تم مجاہدوں کی طرح سَر اٹھاؤ گے

جو اُس کا چاند سا چہرہ نظر نہیں آیا
تو پھر سکون ہمیں رات بھر نہیں آیا

مرض ہے یا کہ سزا یا کسی کی سازش ہے
ہرے درختوں پہ کوئی ثمر نہیں آیا

اے شب گزیدو! اندھیروں کے باب میں لکھنا
چراغ کیا کوئی جگنو ادھر نہیں آیا

نصیب والے ہیں نسبت ہے جن کو سائے سے
ہماری راہ میں کوئی شجر نہیں آیا

نئی عمارتیں بنتی رہیں ، مگر اظہر!
ہمارے حصے میں مٹی کا گھر نہیں آیا!





خواب جو نذرِ انتشار ہوئے!
میرے شعروں میں جلوہ بار ہوئے

قتل گاہوں پہ قفل پڑتے ہی
شہر در شہر جشنِ دار ہوئے

کیسا موسم ہے کھو گئے سارے
سارے اشجار شعلہ بار ہوئے

جلتا صحرا ہے میرے پیشِ نظر،
سارے چہرے پسِ غُبار ہوئے

اپنی ہستی بھی آئینوں جیسی
گھر سے نکلے تو سنگسار ہوئے

ہَر طرف پھیلتی ہَوا کی طرح
اس کی چاہت میں بے دیار ہوئے

بجھی رتوں کا کرم دل پہ بے حساب رہا
گرفتِ موجۂ صرصر میں یہ گلاب رہا!

یہ راز تو تجھے کھونے کے بعد مجھ پہ کھُلا
بلند قد سے مرے میرا انتخاب رہا

یہ اعتراف کراتا ہے مجھ سے سرکش خوں
کہ میرا فیصلہ میرے لئے عذاب رہا

ہتھیلیوں پہ میں اندر کی روشنی لے کر
تمام عمر ہواؤں کے ہمرکاب رہا

سیاہ شال میں لپٹی ہوئی سحر دے کر
عظیم لوگوں کے آنگن میں آفتاب رہا





شبِ سیاہ میں اتنا سُراغ رکھ دینا
قدم قدم پہ لہو کے چراغ رکھ دینا

حساب لیناہو ''لمحاتِ صد بلا'' کا اگر !!
مرے بدن میں ہزاروں دماغ رکھ دینا

بجھانی ہیں اگر آنکھیں تو سب کی آنکھوں میں
مہکتے خوابوں کے سرسبز باغ رکھ دینا

مَیں تشنگی کا ہوں پیکر تو میرے ہاتھوں پر
سمندروں کو بنا کر ایاغ رکھ دینا

مَیں اپنے کاندھے سے خوابوں کی لاش پھینک سکوں
مری حیات میں اتنا فراغ رکھ دینا

یہی بہت ہے کہ کاغذ کے ہاتھ پر اظہرؔ!
حسین لفظوں میں زخموں کے داغ رکھ دینا

○

شور اٹھتا ہے نواحِ جاں کے اندر رات کو
ٹوٹتے ہیں دل پہ نادیدہ سے نشتر رات کو

تولتی ہے مجھ کو ہی میزان بن کر میری ذات
میرے اندر جاگتا ہے یومِ محشر رات کو

دن میں ریگِ دشت کی مانند تپتی ہے مگر
خشک آنکھوں سے اُبلتا ہے سمندر رات کو

لوگ کہتے ہیں کہ میرا عہد کالی رات ہے
کوئی جگنو، کوئی تارہ دُبِّ اکبر رات کو

دیکھتا ہوں دَہر کے سب ضابطے جلتے ہوئے
شعلۂ دیدہ وری کاغذ پہ رکھ کر رات کو

اپنے گرد وپیش سے ہشیار رہنا ہر گھڑی
گشت پہ نکلیں گی تلواریں برادر رات کو

سرنگوں ہوجاتا ہے اظہرؔ خمارِ سرکشی
آہی جاتا ہے اک ایسا موڑ اکثر رات کو





○

سمندر ، کھیت ، دلدل ہوگئے ہیں
نئے نقشے مکمل ہوگئے ہیں !!

ہرے پیڑوں سے بچ کر ہی گذرنا
کہ اب سائے بھی مقتل ہوگئے ہیں

عجب بستی ہے پرچھائیں کی خاطر
یہاں سب لوگ پاگل ہوگئے ہیں !

پہاڑی راستوں پر چلتے چلتے
ہمارے پاؤں اب شل ہوگئے ہیں

اسے کھوتے ہی سب گلرنگ منظر
مری آنکھوں سے اوجھل ہوگئے ہیں

ہمیں محبوب تھا غالبؔ کا ورثہ
ہمارے گھر بھی جنگل ہوگئے ہیں

ہجر کے موسم نے شاخِ احساس کو یوں شاداب کیا
توڑ کے سب زخموں کے ٹانکے آنکھوں کو خوناب کیا

سارے دریا سارے سمندر کو ہم نے پایاب کیا
تب جا کر رنگوں نے ہم پر وَا اپنا ہر باب کیا

خون کہاں تک پانی کرتے بانجھ رُتوں کی یورش میں
دیدہ وروں نے بالآخر اعلانِ شکستِ خواب کیا

تلواروں سے آنکھیں ملائیں نیزوں سے سرگوشی کی
فتح و ظفر کی سبز پری نے تب جا کر آداب کیا

بھیگے موسم، زلف کے سائے، اجلی شام کی نازک بانہیں
میرے عہد نے کیسے کیسے لمحوں کو نایاب کیا





اظہر عطائے نالۂ شبگیر دیکھنا
پَیروں میں اپنے حلقۂ زنجیر دیکھنا

پھر شاہزادہ نکلا ہے گلگشت کے لئے
پھوٹے گی ایک غنچے کی تقدیر دیکھنا

تتلی، گلاب مانا ہیں جاذب نظر بہت
سَر پہ لٹک رہی ہے جو شمشیر دیکھنا

شاید پسند آئے اسے طوفانِ برق و باد
ہے اِک لرزتی چھت مری جاگیر دیکھنا

مت پوچھ کِن عذابوں میں کاٹی ہے زندگی
چہرہ ہے گذرے لمحوں کی تصویر دیکھنا

دستِ شفق سے تا ورقِ گل کسی جگہ
شاید ملے نوشتۂ تقدیر دیکھنا

○

روح میں اُترا ہوا دھوپ کا خنجر دیکھوں
اور خوابوں میں پگھلتا ہوا پیکر دیکھوں

وقت کہتے ہیں جسے آگ کا بہتا دریا
پھر بھی ہر شخص کی خواہش کہ اتر کر دیکھوں

کیوں ہے آنکھوں کے دریچوں میں لہو کا چہرہ
تھوڑی فرصت جو ملے جسم کے اندر دیکھوں

کچھ تو اندازہ ہو سنّاٹوں کی گہرائی کا
پھینک کر آج میں آواز کا پتھر دیکھوں

آرزو جن کی افق تا بہ افق رنگ ملے!
ہائے ان آنکھوں سے جلتا ہوا منظر دیکھوں





○

اتنی خطا پہ جبر کا سارا دباؤ تھا
مَیں درد کی صدا کا دہکتا الاؤ تھا

اب اشک ریز ہیں وہاں سمتوں کے زاویئے
اندھی مسافتوں کا جہاں پر پڑاؤ تھا

گذری رُتوں کا درد بسا تھا نفس نفس
آنکھیں لہو لہو تھیں بدن گھاؤ گھاؤ تھا

کیا پار کرتیں اس کو قیاسوں کی کشتیاں
جِس بحر میں یقین بھی کاغذ کی ناؤ تھا

صدیوں کی دھند بن گیا غفلت کا ایک پل
کچھ اتنا تیز فکرو نظر کا بہاؤ تھا

کرتے تھے رقص ان پہ شعاعوں کے قافلے
جن راستوں پہ میرے لہو کا رچاؤ تھا

اظہر دکھاتا فن کے نگینے کِسے وہاں ؟
ہیروں سے بھی گراں جہاں پتھر کا بھاؤ تھا

وہ میرے واسطے کیا کیا نہ یار کرتا تھا
سلگتے لمحوں کو شاخِ بہار کرتا تھا

وہ چھت پہ چاند کی کرنوں کی شال اوڑھے ہوئے
تمام رات مرا انتظار کرتا تھا

رخوں کے چاند،لبوں کے گلاب، رنگِ حنا
وہ مجھ پہ اپنے خزانے نثار کرتا تھا

بڑے سکون سے سُن کر تمام تاویلیں
بس اک نظر سے مجھے شرمسار کرتا تھا

یہ جانتا تھا کہ آوارہ ہوں مگر پھر بھی
خلوصِ دل سے مرا اعتبار کرتا تھا

نوازتا تھا وہ اشعار چوم کر میرے
نہ جانے کتنا مِرے فن سے پیار کرتا تھا





محدودیت کو توڑنے والی لکیر ہوں
یہ اور بات اپنے بدن میں اسیر ہوں

جِس کو تلاش آج تک اپنے ہدف کی ہے
تخلیق کی کمان کا وہ پہلا تیر ہوں

مجھ پر یہ سنگباری بس اتنی خطا پہ ہے
اقلیم بے حِسی میں دلیلِ ضمیر ہوں

اشکوں کے موتی زخم کے ہیرے،لباس یاس
اِس زاویئے سے دیکھئے میں بھی امیر ہوں

سنّاٹوں کے غبار میں گم ہوگیا کہاں
جِس کو تھا زعم شہرِ صدا کا سفیر ہوں

اظہر! ہر ایک دور میں دنیا کے سامنے
تاریخ جس کو رکھتی ہے ایسی نظیر ہوں

اپنے حق میں پیدا اک دامِ حریفائی نہ کر
پتھروں کے درمیاں تقسیم دانائی نہ کر

نوکِ خنجر چومتی ہے اس کو میرے شہر میں
آنکھ اپنی بند رکھ تشہیرِ بینائی نہ کر

چند ہی لمحوں میں ہوجاتے ہیں کتنے معجزے
شاہِ لشکر کش ابھی اعلانِ پسپائی نہ کر

چھین لے گی سر سے سارے سائے اک دن دیکھنا
میرا کہنا مان خوشبو سے شناسائی نہ کر

داعیِ تہذیبِ نو کے در پہ کس نے لکھ دیا
زخم بھردے رُوح کا یہ پھر مسیحائی نہ کر !





کہیں سُراب کی صورت کہیں ندی ہوں میں
ہزاروں روپ ہیں میرے کہ زندگی ہوں میں

مِرے لہو سے تو شمشیریں کند ہوتی ہیں
اَنا غریب کی ، باغی کی سرکشی ہوں میں !

مِری طلب ہے تو اندیشۂ خطر سے گذر
کہ دھند میں چھپے منظر کی دلکشی ہوں میں

مجھے بہار کا آنچل سمیٹ لیتا ہے
عظیم دوست تری آنکھ کی نمی ہوں مَیں !

لکھا ہے ہونٹوں پہ اس پھول جیسی لڑکی کے
تمام موسمِ گل کی شگفتگی ہوں میں

یہ چند لفظ بکھرنے سے روک لیتے ہیں
کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ زندگی ہوں میں

اِک دشتِ بے شجر ہے گھڑی دوپہر کی ہے
پَیروں میں آبلے ہیں مصیبت سفر کی ہے

نوخیز ڈالیوں کی حفاظت کریں شجر
دستِ ہوس کو جستجو کچے ثمر کی ہے!

کرلی ہیں تیرے عشق میں سب انگلیاں قلم !
کتنی عجب ادا ترے شوریدہ سَر کی ہے

موجوں نے یہ پیام دیا اور سمٹ گئیں !
تیری شکستہ کشتی امانت بھنور کی ہے

آوارگی کے پیروں میں زنجیر ڈال دیں
یہ حیثیت کہاں کسی دیوار ودَر کی ہے

لرزیدہ جسم والوں کو عزمِ حسینؓ دے
خواہش ہر ایک نیزے کو پھر آج سَر کی ہے





○

اندر کا اضطراب یوں نغموں میں بوگیا
ساتوں سُروں میں درد کی لہریں سموگیا

آنسو کا ایک قطرہ گرا اُس کی آنکھ سے
اور زندگی کی ساری امنگیں ڈبوگیا

دیکھی جو سَرد جنگ ہر ایک پیڑ کے تلے
مَیں دھوپ میں جھلستی زمیں پر ہی سو گیا

ہر شخص کے بدن کو ہے چہرے کی جستجو
ہر چہرہ کہہ رہا ہے مرا جسم کھوگیا

کب تک جلے مکانوں کے لکھو گے مرثیئے
اب خاک ڈالو ان پہ جو ہونا تھا ہوگیا

○

بہار پھولوں سے شاخیں سجونے آئی ہے
یا میرے زخموں میں نشتر چبھونے آئی ہے

یہ زینہ زینہ اترتی ہوئی سلونی شام !
مِری پلک میں ستارے پرونے آئی ہے

مَیں آگ آگ ہوں اس پر بھی یہ سُلگتی دھوپ
مِرے وجود میں تحلیل ہونے آئی ہے

ہَوا کے رتھ پہ حسیں بادلوں کی شہزادی
سُلگتے صحرا کا دامن بھگونے آئی ہے

مَیں پل میں حلقۂ گرداب سے نکل آؤں
مگر یہ بھیڑ جو مجھ کو ڈبونے آئی ہے

اے زندگی یہاں پتھر کے لوگ رہتے ہیں
تو پتھروں میں کہاں خواب بونے آئی ہے





لہو میں ڈوبی ہوئی فتح بوڑھی ماں کی طرح
جوان بیٹوں کی میت پہ رونے آئی ہے

لرزتی کانپتی سادہ سی اِک کِرن اظہرؔ!
مِرے وجود میں مہتاب ہونے آئی ہے

مجھے سفر میں ہے خدشہ بدن پگھلنے کا !
خیال چھوڑ دے تو میرے ساتھ چلنے کا

عجیب رات ہے کٹتی نہیں کسی صورت
لگے ہے اب کوئی سورج نہیں نکلنے کا

لہو لکھے گا تمہاری بھی موت کا فرمان
تماشہ دیکھ رہے ہو جو سَر اچھلنے کا

ابھی تو کچھ نہیں موسم ذرا بدلنے دو
کرشمہ دیکھنا پوشاک کے بدلنے کا

مَیں سانس سانس لئے تیرے قرب کی خواہش
عذاب جھیل رہا ہوں لہو میں جلنے کا

شمارِ زخم کی فرصت نہیں جنہیں اظہر
جواز کیا لکھیں احساس کے کچلنے کا





ننھے ننھے کتنے پودوں کو جواں اُس نے کیا
یوں ہُوا کہ دھوپ ہی کو سائباں اس نے کیا

اندر اندر موجِ غم نے مجھ کو کاٹا عمر بھر
لمحہ لمحہ اپنی ہستی کو دھواں اس نے کیا

جِس کو ہر لمحہ دعائیں بھیگتی پلکوں نے دیں
میری اپنی ذات کو سؤنا مکاں اس نے کیا

سانپ کی مانند جب ڈسنے لگی بے رونقی !
شہر کے سب راستوں کو خونفشاں اُس نے کیا

پھونک کر اظہر طلسم منصبِ جاہ و حشم
ساری بستی کو اچانک بے زباں اس نے کیا

سفاکیت میں ڈوبی فنکاری ہوگئی ہے
دیواروں پر لہو سے گلکاری ہوگئی ہے

ہم سرکشیدہ ایسی بستی میں ہیں جہاں پر
بے رحم قاتلوں کی سرداری ہوگئی ہے

کیسی عجب وَبا ہے سنجیدہ لوگوں کو بھی
آئینہ دیکھنے کی بیماری ہوگئی ہے

رہتی تو تھی محبت گہرائیوں میں دل کی
اب یہ حسین شئے بھی بازاری ہوگئی ہے

اِک خطہ ہی نہیں اب ساری زمیں ہے بابُل
عام اِک ہُنر کی صورت بدکاری ہوگئی ہے

جلتے مکاں کے حق میں کیسے زبان کھولے
اظہرؔ! اب اس کی ہستی سرکاری ہوگئی ہے





بدن پہ خاکۂ گُل سا شگاف کرنے لگیں
تو دستِ سنگ کا ہم اعتراف کرنے لگیں

یتیم ہوتی ہے تاریخ ایسے لمحوں میں !
حریف دار ہی جب اعتکاف کرنے لگیں

تو اور پائیں گی کیا بانجھ موسموں کی سوا
شجر سے شاخیں اگر اختلاف کرنے لگیں

عجب نہیں کہ ترے کپکپاتے ہاتھوں کا
یہ چاند اور ستارے طواف کرنے لگیں !

عذاب اترتا ہے تب ریت ریت ہونے کا
لہو کے جذبوں سے جب انحراف کرنے لگیں

خوف سے اس طرح بستی کا ہر اک گھر جاگے
جیسے لَو، بجھتے چراغوں کی لرز کر جاگے

سرحدیں بن گئیں شمشیر اکائی کے لئے!
کیسے قطرے کے وسیلے سے سمندر جاگے

اِن دنوں ظلِّ الٰہی پہ جنوں طاری ہے
دیکھئے کِس گھڑی ہنگامۂ محشر جاگے

کیا ہمارے ہی لئے ساری رتیں بانجھ ہوئیں
یا خدا چاروں طرف ریت کا منظر جاگے

خون کا قطرۂ آخر کفِ صحرا پہ رکھا
اب تو اس تپتے خرابے کا مقدر جاگے

کوئی موسم ہو ترے درد کی البیلی کرن
موجِ صد رنگ کی صورت مرے اندر جاگے

رات کی ساری کمائی ہے اے سورج کی کِرن
برگِ گل پہ جو چمکتا ہوا گوہر جاگے





سفیر دن کا مکاں سے نکالتا ہے مجھے
پھر ایک چیختے برزخ میں ڈالتا ہے مجھے

تھکن بوجھ سے جب لڑکھڑانے لگتا ہوں
مِرے مکان کا نقشہ سنبھالتا ہے مجھے

ہزاروں چُبھتے سَوالات کی فضاؤں میں
مَیں سونے جاؤں تو بستر اُچھالتا ہے مجھے

نہ جانے کون سا موتی مرے وجود میں ہے
کہ علم و فن کا سمندر کھنگالتا ہے مجھے

مَیں دھنسنے لگتا ہوں جب بھی ہَوس کی دلدل میں
مِرا ضمیر ہی باہر نکالتا ہے مجھے

مَیں عکس رنگ ہوں موسم کا آئینہ اظہرؔ
چھپا کے سینے میں صدیوں سے پالتا ہے مجھے

سورج کے ڈوبتے ہی یہ چولا بدلتے ہیں
ڈاکو محافظوں کی قبا میں نکلتے ہیں

مَیں نے نظامِ جبر پہ انگلی اٹھائی ہے
سب لوگ مجھ کو دیکھ کے رستہ بدلتے ہیں

مَیں تو بڑھانے نکلا تھا اوروں کے حوصلے
میرے ہی سر سے خون کے دھارے اُبلتے ہیں

لفظوں کے ماسوا مِرا ہمراز کون ہے؟
سو میرے راز لفظوں کے پیکر میں ڈھلتے ہیں

اظہرؔ جوان اپنے خزانے لٹا چکے
اب تتلیوں کو دیکھ کے بس ہاتھ ملتے ہیں





ہر چند آشکار مری بے گناہی ہے
میرے خلاف صاحبِ زر کی گواہی ہے

اب اُن پہ منحصر جسے چاہیں ٹٹول لیں!
اندھوں کے ہاتھ منصبِ عالم پناہی ہے

آثار سب نمایاں ہیں اِک تازہ جنگ کے
تلوار بیچتا ہے تو کیسا سپاہی ہے

شاید کسی کے پاس نہیں اس کا کوئی حل
چاروں طرف جو پھیلی بھیانک تباہی ہے

درویشِ بے گلیم ہوں نانِ جویں بہت
تجھ کو اگر ہوس ہے تو وہ مرغ و ماہی ہے

اظہرؔ ہے جس کے ہاتھوں میں شمشیر برہنہ
سب کہہ رہے ہیں اس سے تری بادشاہی ہے

کیسے بچوگے دھند کے اندھے عذاب سے
برگشتہ ہوکے روشنی والی کتاب سے

ابھریں گے وہ نوشتۂ دیوار طرح
جِن کو مٹا رہا ہے تعصّب نصاب سے

ثروت اور اقتدار بڑے لوگ پاگئے
غربت کا تحفہ ہم کو مِلا انقلاب سے

سب کو برت کے خون سے لکھنا پڑا ہمیں
مِلتا ہے ہر نظریے کا رشتہ سراب سے

اظہؔر حقیقتوں کے دہکتے ہوئے الاؤ!
شادابیاں نچوڑ رہے ہیں شباب سے





کچھ تو بتا اے دھوپ کی یلغار کیا ہوئے
تھی جِن کی ذات سایۂ اشجار کیا ہوئے

ٹھوکر میں جن کی رہتی تھیں جابر حکومتیں
وہ صاحبان جبّہ و دستار کیا ہوئے

جو پاسدار عظمتِ نانِ جویں کے تھے
تھے خاک جِن کو درہم و دینار کیا ہوئے

جِن کے نقوشِ پا پہ بہاریں کریں قیام
وہ تارکینِ سبزہ و گلزار کیا ہوئے

جِن کا وجود مرہم زخمِ حیات تھا
دستِ شفیق اور لبِ گلبار کیا ہوئے

وہ صاحبانِ صدق و یقیں مہرِنیم شب
تاریکیوں میں تھے جو ضیأ بار کیا ہوئے

اربابِ دار و گیر کی سختی کے باوجود
طاغوت کے لئے تھے جو تلوار کیا ہوئے

حجرے کو اپنے چھوڑ کے سیلابِ ظلم میں
بن جاتے تھے جو آہنی دیوار کیا ہوئے

تاریکیوں کے سائے لپکنے سے پیش تر !
کرتے تھے جو ضمیر کو بیدار کیا ہوئے

اظہرؔ تھے جن کی ذات کے دشمن بھی معترف
وہ صاف گو، وہ صاحبِ کردار کیا ہوئے





○

تیرا خیال تجھ سے بچھڑنے کا غم رکھیں
تا عمر تیرے واسطے آنکھوں کو نم رکھیں

پانی، شجر کا سلسلہ اس موڑ تک ہی ہے
گر حوصلہ ہو آپ میں آگے قدم رکھیں

ڈھالے ہیں مرے دیدۂ تر نے مہ ونجوم
پلکوں پہ میری چاند ستارے علَم رکھیں

اے کالی رات کوششِ بیعت فضول ہے
سو آفتاب ہم سرِ نوکِ قلم رکھیں

رکھ اپنے پاس خلعتِ دیدہ وری کی بھیک
اہلِ نظر تو اس کو نہ زیرِ قدم رکھیں

جاناں! یہی ہے مذہبِ آشفتگانِ عشق
تقدیر تیرے گیسوئے پیچاں سے خم رکھیں

سارا بدن لہو کا رواں مشتِ پر میں ہے
''دِن ڈھل چکا ہے اور پرندہ سفر میں ہے''

چبھتے ہوئے سوال لئے روز کی طرح
تنہائی منتظر مری ویران گھر میں ہے

اے دوست عکس ہے ترے رنگیں لباس کا
یہ کائناتِ رنگ جو تتلی کے پَر میں ہے

گم گشتگی کے خوف سے ہر چہرہ ہے دھواں
یہ نسل بے یقینی کی کس رہ گذر میں ہے

مَیں بھی قبا پہ ''چاند ستارہ'' سجاتا ہوں
میرا بھی نام حلقۂ نامعتبر میں ہے

کب سے ہیں کھلتے پھولوں کی آنکھیں لگی ہوئی
اظہرؔ! وہ دلکشی مِرے زخمِ ہنر میں ہے





خود اپنی آگ میں جلتا شباب ہوں جاناں
سنبھال مجھ کو بکھرتا گلاب ہوں جاناں

اتر کے تجھ میں بدن تیرا جگمگاؤں گا
مَیں کوئی ذرّہ نہیں آفتاب ہوں جاناں

ہر ایک سوال جہاں آ کے سَر پٹکتا ہے
مَیں اپنی ذات میں ایسا جواب ہوں جاناں

ہے جس کے لفظوں میں شامل ترے نفس کی مہک
میں دھڑکنوں کی لکھی وہ کتاب ہوں جاناں

جو ہو سکے تو مجھے قید کر لے آنکھوں میں
مَیں خواہشات کا آوارہ خواب ہوں جاناں

○

بے چہرگی کی دھند ہٹاتا نہیں کوئی !
میرا وجود کیا ہے بتاتا نہیں کوئی

اُترے رگوں میں خون کی سرگوشیاں سُنے
آنکھوں میں اس طرح سے سماتا نہیں کوئی

کیا سب سیاہ رات سے یارانہ کرچکے
مثلِ چراغ خود کو جلاتا نہیں کوئی

مجھ پر ہے ختم منصبِ دادورسن کہ اب
انگلی برائے نام کٹاتا نہیں کوئی

اِک ہاتھ منہ پہ جم گیا اور چیخ گھٹ گئی
پھر آگے کیا ہُوا ، یہ بتاتا نہیں کوئی

آئے گی زندگی میں کہاں سے کوئی کِرن
ماتھے پہ اپنے چاند سجاتا نہیں کوئی !





○

یہ صِلہ اعمالِ انسانی کا ہے
ذرّہ ذرّہ منتظر پانی کا ہے

ہوگئی ہے آج بینائی عذاب
ہر طرف منظر ستم رانی کا ہے

ہر کرن جیسے مسرّت کا لہو
جشن کس مجروح تابانی کا ہے

خواب تکمیلِ بشارت جل چکا
آنکھ میں اب نقش حیرانی کا ہے

مجھ پہ نیزے ہیں غلاموں کے تنے
پھر بھی سَودا سَر میں سلطانی کا ہے

طے ہوا قتلِ صَدا کا مرحلہ!
آگے خوشبو کی نگہبانی کا ہے

شہر تو بس جائیں گے عالم پناہ
مسئلہ تو دل کی ویرانی کا ہے

تنکے ہیں اظہر لہو کی موج کے
یہ نتیجہ مرثیہ خوانی کا ہے

صحرا ، شجر ، پہاڑ ، سمندر بدل گیا
جھپکی جو آنکھ سارا ہی منظر بدل گیا

جس کی بہادری کے قصیدے پڑھے گئے
نیزہ چمکتے ہی وہ دِلاور بدل گیا

رگ رگ میں ایک موجۂ آتش کا رَم رہا
ہر چند آفتاب کا تیور بدل گیا

مَیں بھی ہرے شجر کی طرح تھا کبھی، مگر
محرومیوں کی دھوپ میں جل کر بدل گیا

دروازے مجھ پہ جب سے اصولوں کے وَا ہوئے
اظہؔر شناسا چہروں کا لشکر بدل گیا





دے کر گلاب خوابوں کے آنکھوں کی جھیل کو
وہ کاٹتا ہے گرم ہَوا کی نکیل کو

دہلیزِ وقت سبز رتوں کا خراج دے
ہم آئے ہیں گِرا کے بدن کی فصیل کو

دے کر سراغِ رہ کو لہو کا نیا لباس
کِس نے کیا ہے مسخ ہر اک سنگِ میل کو

کِس زاویئے کی دھوپ مقدر میں ہے لکھی
رد کر چکی جو سائے کی ہر اک دلیل کو

کیا خوفِ سنگ فن کی صلیبوں پہ آج بھی
ہم سہہ رہے ہیں طنز کی زہریلی کیل کو

ماحول کے حصار میں اظہؔر ہیں نیم جاں
آنکھوں میں ہم لئے کسی شکلِ جمیل کو!

تقلید کی روش کا انوکھا مآل تھا
ہر آئینہ ہمارے لئے اک سوال تھا

اندر شکستِ ذات کا طوفان تھا بپا
پھر بھی وہ ہنس رہا تھا عجب با کمال تھا

امواجِ خواہشات جسے روندتی رہیں
میں رزم گاہِ زیست کا وہ پائمال تھا

کاٹا سفر ہتھیلی پہ رکھ کر شعاعِ ذات !
ورنہ ہر اک سمت اندھیروں کا جال تھا

اظہرؔ! اس حُسنِ سادہ کو تشبیہ کس سے دوں
وہ دلنواز آپ ہی اپنی مثال تھا





ستم کی دھوپ میں ممنوع جن کے سائے ہیں
وہ سب شجر مرے اجداد نے لگائے ہیں

اے میری پشت میں خنجر اتارنے والے
کبھی ترے لئے سینے پہ زخم کھائے ہیں

زباں کھلے تو وہاں سَر، زمیں پہ آتا ہے
یہ کیسے کاندھے پہ سر کو بچا کے لائے ہیں

ہیں آج اتنے غضبناک کیوں اندھیرے ہَوا
کیا میرے نام پہ اس نے دیئے جلائے ہیں

نواحِ جاں میں در آیا ہے ہجر کا موسم
اداس آنکھوں میں کچھ اشک جگمگائے ہیں

آؤں جو ضد پہ قدموں تلے بحر و بَر رکھوں
اور زخم زخم ہاتھوں پہ شمس و قمر رکھوں

اب بھی رگوں میں خون کا دریا ہے موجزن
کیسے عدو کے قدموں پہ تیغ وسپر رکھوں

کافی نہیں تجھے یہ لہو کی شہادتیں ؟
کیا جاں نکال کر مَیں ترے ہاتھ پر رکھوں

سوچا تھا آگے وادی میں خیمہ لگاؤں گا
آیا ہے حکم جاری میں اپنا سفر رکھوں

مجھ سے تو یہ نہ ہوگا کہ گھبرا کے طنز سے
اندھوں کے بیچ میں نقوشِ ہنر رکھوں

اے پیکرِ صبا ترے دیدار کے لئے!!
کب تک میں اپنی آنکھیں یونہی دَربدر رکھوں





تقسیم لمحے لمحے میں یوں ہوگئی حیات
فرصت نہیں کہ سوچ سکوں کیا ہے میری ذات

ہم نے خود اپنی آنکھوں میں کانٹے چبھولئے
تب جاکے ہاتھ آئی ہے لفظوں کی کائنات

کِس کی تلاش ہے جو خلاء میں بکھر گئے
رشتہ زمیں سے توڑکے میرے تخیلات

حد سے سوا ہُوا نئی تہذیب کا کرم
پوشیدہ اب نہیں رہے اسرارِ جنسیات

اظہرؔ شعاعِ ذات کواپنی سپر بنا
نیزے سپاہیوں کے لئے آگئی ہے رات

یہ کس مقام پہ لائی ہے زندگی مجھ کو ؟
کہ ناگ کی طرح ڈستی ہے روشنی مجھ کو !

سپاہ و ملک و علم تخت و تاج دے یارب!
جو تو نے بخشا مزاجِ شہنشہی مجھ کو !!

ہزار طرح کے مجھ پر عذاب لاتی ہے
بہت عزیز ہے لیکن یہ سرکشی مجھ کو !

مَیں کیسے جاؤں کہ مٹی قدم پکڑتی ہے
بہت بلاتی ہے شہروں کی دلکشی مجھ کو!

کبھی ہوس کا دہکتا الاؤ میں بھی تھا
عظیم لڑکی نظر سے بجھا گئی مجھ کو !

لہو کو پانی کی صورت بہا کے کیا پایا
خیال آتا ہے اظہؔر کبھی کبھی مجھ کو !





تعبیر کی صلیب بہت اُن کو کھَل گئی
خوابوں کی جھیل جن کی بصیرت نِگل گئی

رگ رگ میں دردبن کے لہو دوڑنے لگا
تنہائیوں کو چھیڑ کے جب شام ڈھل گئی

آیا تھا اس کے کانپتے ہونٹوں کا جب خیال
بجلی سی لہر جسم کے اندر مچل گئی !!

اب تک تو سبز پتوں سے محروم ہیں شجر
کہنے کو لوگ کہتے رہیں رُت بدل گئی

ہم منتظر سحر کے رہے دشتِ خواب میں
اور کالی رات کتنے ہی سورج نِگل گئی !

اظہؔر ہے بیسویں صدی وہ حرفِ آتشیں
جِس کی ادائیگی میں زباں میری جل گئی

○

جب تک مِرا وجود ہوا کا عدو نہ تھا
مانندِ برگِ خشک اڑا کو بہ کو نہ تھا

رنگین ساعتوں کے بھنور میں تھا ہر نفس
ٹوٹا بھنور تو میری رگوں میں لہو نہ تھا

اتری تہہِ شگفتہ مزاجی تلک ہے دھوپ
یوں آدمی تو پہلے کبھی شعلہ رو نہ تھا

اِس طرح سے خزاں کا مسلسل عذاب تھا
جیسے زمیں کے سینے میں سیلِ نمو نہ تھا

شاید تھا زہر کوئی ہَوا میں گھلا ہوا
ہر بستی دیکھی، فرد کوئی سرخرو نہ تھا

یوں کھوگئے تھے دل میں لئے تیری جستجو
اپنا خیال تک بھی دمِ جستجو نہ تھا

اظہر! شعاعِ درد نے چمکادیا اسے
ورنہ حسین اتنا رخِ آرزو نہ تھا





○

چاند سے جھانکنا اور نیند کو غارت کرنا
اس کی فطرت میں ہے چپکے سے شرارت کرنا

رات کی ساری کمائی ہے ترے ہاتھوں پر
برگِ گل ننھے سے قطرے کی حفاظت کرنا

میری پیشانی، مرے ہونٹ، مرے بازو کو!
پھر عطا پھول سے ہونٹوں کی حرارت کرنا

حاکمِ وقت تری خاک اُڑا سکتا ہے
ہم سے دُرویشوں کا اعلانِ بغاوت کرنا

ہیرے کنکر جہاں قیمت میں ہوں یکساں اظہر
ان زمینوں کی طرف سوچ کے ہجرت کرنا

یہ مرحلہ نہیں تھا ہمارے گُمان میں
موجیں پناہ لیں گی کبھی بادبان میں !!

تشویش کا ہے مرحلہ عالم پناہ پر
مصروف اک پرند ہے اونچی اڑان میں

مت ڈھونڈ! میری آنکھوں میں تتلی شفق گلاب
خوابوں کی راکھ اڑتی ہے اب اس مکان میں

کِن ناشناس لوگوں میں پیدا کیا ہمیں
مصروف پہلی سانس سے ہیں اِمتحان میں

یہ کیا کہ اس امیر نے شمشیر بیچ دی !
اظؔہر تمام فوج تھی جس کی کمان میں





ہٹا کے روح سے قیدِ مکاں مرے اللہ
بکھیر مجھ کو کراں تا کراں مرے اللہ

ترے سوا جو کسی سے طلب کروں کچھ بھی
تو چھین لینا تو مجھ سے زباں مرے اللہ

مجھے ہے گر کے سنبھلنے کا حوصلہ کافی
نہ دینا پیروں کو بیساکھیاں مرے اللہ

ہمارا عہد کہ صحرا کی دوپہر جیسا
بس ایک نام ترا سائباں مرے اللہ

یہ ہر مقام پہ گرنے روک لیتی ہے
خلِش ضمیر کی رکھنا جواں مرے اللہ

تمام دیدۂ جوہر شناس فریادی
گُہر اگلتیں نہیں سپیاں مرے اللہ

## بسلسلۂ جشن شادی خانہ آبادی ہمشیرہ عزیزہ رُمّانہ بنت خلیل احمد کے نام

نتیجۂ فکر:۔ عبدالسّلام اظہؔر رسولپورہ، مالیگاؤں

۳۰؍جنوری ۱۹۸۴ء

فضا میں کیف ہے خوشبو نکی ہر سُو نغمہ باری ہے
مگر ہم پر بہن یہ ایک لمحہ کتنا بھاری ہے
بہت مجبور ہیں ہم بھی یہی حُکمِ شریعت ہے
نیا گھر یعنی جَلتی اور سُلگتی ریت کا صحرا
شِکن ماتھے پہ آنے پائے نہ شوہر کی خدمت میں
کبھی جب وقت آئے تو کڑے لمحوں کے ہاتھوں پر
بچانا اختلافی اُلجھنوں سے ذہن ودِل ایسے
وقارِ انفرادی یہ صِفت دے گی بہن تجھکو
صبالائی ہے جنّت سے پیام رُوح نعمانی
یہ رکھنا یاد ہم ماحول کا احسان نہیں لیتے
خُدا توفیق دے تجھکو بھی نانی جان کے جیسی
شَفق جگنو اُجالا کہکشاں موسم گُلابوں کا
ستارے چاند اور سورج تیری دہلیز پر اُتریں
کبھی آئیں نہ تیری آنکھ میں جلتے ہوئے آنسو

یہ لمحہ سب کی خاطر جیسے بادِ نو بہاری ہے
جُدا ہونے سے تیرے اَشک خوں آنکھوں سے جاری ہے
کہ اس گھر سے جُدا ہو کر نئے گھر تجھکو جانا ہے
تجھے اپنے عمل سے اسکو اک گلشن بنانا ہے
ہمیشہ اپنے شوہر کی خوشی پیشِ نظر میں رکھنا
دُعا کے صبر و اخلاص و مروّت کے گُہر رکھنا
تو معمولی سی باتوں سے ہمیشہ در گذر کرنا
بزرگوں کا ادب چھوٹوں پہ اُلفت کی نظر رکھنا
کہ بیٹی عزم اور ایماں جہاں تسخیر کرتا ہے
ہماری ذات سے ماحول بنتا ہے سنورتا ہے
جو تیرے آنگن سجانے کو دھنک شام وسحر آئے
ہر ایک پَل زندگی کا رنگ میں ڈوبا ہوا دیکھے
تیرا آنگن سجانے کو دھنک شام و سحر آئے
سُنہرے خوابوں کی تکمیل کا منظر سدا دیکھے





## خراجِ عقیدت مولانا عبدالحمید نعماؔنی

(وفات: ۲۰؍جنوری ۱۹۸۳ء)

یہ بستی یاد کر کے جس کو اب تک خون روتی ہے
اسی کی داستاں ان گونگی دیواروں میں سوتی ہے
چراغِ دینِ حق سے ہے منوّر نقش نعماؔنی!
اجالے بانٹے جاتے ہیں کرن تقسیم ہوتی ہے

## دوست مسعود رمضان پینٹر کے لئے

یا رب تمام رنگ برش پر اُتار دے
ڈزائنوں کے ڈھیر مجھے بے حساب دے
تو خوب جانتا ہے کہ میں آرٹسٹ ہوں
مجھ کو برائے عشق انوکھا شباب دے

ہم آشفتہ سروں نے میؔر سے جب سے یاری کی!
چلّو چلّو خون اُگل کر ہر لمحہ گُلگاری کی !